بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں! ایک ہو جاؤ اور نیک ہو جاؤ

ملت حجاز کی ہے مصروف فرقہ بندی
نادان لٹ رہے ہیں سورج کی روشنی میں
اقبال

انوار الاسلام

از: ابو الفارق واسطی

مقام اشاعت:
ندیم منزل۔ ندیم شہید روڈ
سمن آباد۔ لاہور

انوارُ الاسلام

دیباچہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

بعد حمد و نعت خدمت برادرانِ اسلامی میں عرض ہے کہ اس بندۂ حقیر کو ایک ایسا موقع پیش آگیا کہ ایک ہندو فلاسفر نے عقائد و عباداتِ اسلامی پر کچھ اعتراضات پیش کئے اور بعون اللہ تعالیٰ عقل و فطرت کی روشنی میں معترض کو جوابات دے سکا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے جو دہریت کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر مذہب سے بیزار ہو چکے تھے، بہت سے شکوک و اعتراضات سنے اور ہر ایک کو عقلی و فطری دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ جن میں سے بحمد اللہ اکثر راہِ راست پر آگئے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں بندۂ حقیر نے ایک رسالہ "پیغامِ رسول" شائع کیا تھا، جس میں حدیث من قال لا الٰہ الا اللہ وجبت لہ الجنۃ کی شرح بیان کی تھی۔ اسی رسالہ کے باب دوم میں وہ سوالات جمع کر دیتے تھے، چاہتا تھا کہ ان کے مفصل جوابات شائع کروں مگر وہ مسودات اس وقت شائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب ان تمام کو اس رسالہ "انوار الاسلام" میں جمع کر دیا ہے، امید ہے کہ یہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دہریت اور لادینی کے پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنے میں معین ہوں گے۔

رسالہ کے آخر میں رسالہ "پیغامِ رسول" کے باب دوم کی جس میں تمام سوالات درج تھے، پوری نقل شامل کر دی گئی ہے تاکہ مفصل سوالات ناظرین کی نظر سے گذر سکیں۔ والسلام

خادم المسلمین:- ابوالفارقی واسطی

انوار الاسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض یولج اللیل
فی النھار و یولج النھار فی اللیل و الصلوٰۃ و السلام
علی حبیبہ سید الصادقین و المتقین اشرف الانبیآء
والمرسلین محمد ن المصطفٰی و الہ الطیبین الطاھرین
و اصحابہ الصلحین من یومنا الی یوم الدین امّابعد
بندہ عاصی برادرانِ اسلامی کی خدمت میں پہلے ایک کیفیت قلبی کا ذکر پیش کرتا
ہے جس کے بعد اصل مضمون پیش کرونگا۔ وھوھذا

لکھنؤ میں یوسف حسین خان صاحب ایک مشہور بیرسٹر تھے۔ صاحب جائداد کثیر۔
گویا ایک چھوٹے سے تعلقہ دار تھے۔ ان کا ایک موضع "لبہا" لکھنؤ سے چھ میل جانب
شمال واقع تھا جہاں کنکر بہ کثرت نکلتا تھا۔ اس کے لئے بیرسٹر صاحب نے اس موضع
میں کنکر کے چونے کا ایک کارخانہ قائم کیا ہوا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اس کارخانہ کا چارج میرے
ہاتھ میں آیا۔

موضع کے مکھیا ایک دوبے جی (برہمن پنڈت) تھے۔ جو علم نجوم میں اچھی مہارت
رکھتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا جس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہوگی، اکثر کارخانے آتا۔ اس کے
ساتھ اکثر بات چیت ہوا کرتی۔

اس طرف بارش اکثر ۱۵ جون کے قریب قریب شروع ہو جاتی تھی مگر اس سال

بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ جون کی آخری تاریخیں تھیں مگر بارش کا نام و نشان نہ تھا۔ گرمی بڑی شدت کی پڑ رہی تھی۔ لوگ گرمی سے تڑپ رہے تھے۔ بارش کی دعائیں کر رہے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک روز مکھیا جی کے صاحبزادے تشریف لائے، دفتر میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ بارش کا ذکر آ گیا۔ پنڈت جی کہنے لگے:

"ابھی بارش نہیں ہو سکتی۔ جوتش میں مہورت ہی نہیں۔ ابھی تو پندرہ دن بارش نہ ہو گی۔"

میری زبان سے نکل گیا کہ:

"رب چاہے تو ہو سکتی ہے۔"

پنڈت بے ساختہ بولا:

"اجی رب بھی چاہے تو کیا ہو سکتا ہے۔ جب مہورت ہی نہیں تو بارش ہو ہی نہیں سکتی۔"

پنڈت جی کا یہ فقرہ ایک نشتر تھا جو دل میں اتر گیا۔ دل کی حرکت بہت تیز ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مالک کی طرف لَو لگ گئی۔ دل کہتا تھا کاش کہ یہ گستاخانہ فقرہ سننے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔ فوراً ایسا ہوا جیسے کوئی دل میں ڈالتا ہے کہ کہہ دے "بارش ہو گی"۔ میں نے فوراً بغیر ارادے کے ہی کہا "بارش ضرور ہو گی"۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے "اجی بارش نہیں ہو سکتی"۔ میں نے کہا "آج ہی ہو گی"۔ پنڈت نے کہا "ممکن ہی نہیں"۔ میں نے کہا "ابھی ہو گی"۔ اور یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل رہا تھا۔

دل میں ایک امنگ سی اٹھ رہی تھی کہ آسمان کو دیکھ۔ میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا پنڈت ہنستا رہا۔ اتنے میں ایک ابر نمودار ہوا۔ میں نے کہا دیکھو ابر نمودار ہو رہا ہے۔ اس پر پنڈت زور سے ہنسا اور بولا "اجی یہ کیا ہے"؟ اتنے میں وہ بتدریج بڑھتا

رہا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر افق پر چھا گیا اور بارش ہونے لگی پھر خوب زور کی بارش ہوئی۔ بس سجدۂ شکر بجا لایا اور جتنے مسلمان وہاں اس وقت موجود تھے بہت خوش ہوئے اور سب نے پنڈت جی کو شرمندہ کیا فالحمد للہ رب العلمین

اس وقت تو میں آبائی مذہب کا پجاری تھا۔ نہ دین کا پتہ نہ حقائق سے واقف، جہالت و لاشعوری کی تاریکی میں غرق تھا۔ پھر بھلا اس کیفیت کو جو اس وقت قلب پر وارد ہوئی کیا سمجھ سکتا تھا۔

جب کچھ ہوش آیا اور دین کے بعض راز معلوم ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ کیفیت قلبی تو رب کی بڑی نعمت ہے۔ اسی کی طرف اس آیہ وافی ہدایہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ	پس جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں، اس وقت اللہ کو خلوصِ دل سے پکارتے ہیں۔

جب یہ کیفیت قلب پر طاری ہوتی ہے تو جس شے کی انسان کو طلب ہوتی ہے، خواہ دنیا کی ہو یا دین کی مالک اس کو عطا فرماتا ہے۔ کیسا ہی مشکل مسئلہ ہو اسی وقت حل ہو جاتا ہے۔ اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (پ۲۰ ع ۱)	کون ہے جو قبول کرتا ہے، پکار مضطر کی جب وہ اسے پکارے اور مصیبت کو دور کرتا ہے۔

یہی وہ کیفیت ہے جس کے طاری ہونے سے سائنس دانوں پر فطرت کے راز منکشف ہوتے رہے۔

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد بھی اس کیفیت کے بعض اوقات تجربات ہوتے رہے مگر اپنی جہالت و نادانی کے سبب اس کی قدر و قیمت نہ سمجھ سکا۔ اب اصل مضمون

کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۱۹۲۵ء میں میں ڈیرہ دون یو۔ پی انڈیا میں ایک چائے باغیچہ کے مالک کے ہاں مہمان تھا۔ چائے باغیچہ کے منیجر ایک کشمیری پنڈت جو فلاسفی کے گریجویٹ، بڑے قابل اور غیر متعصب شخص تھے۔ فارسی کے عالم اور ہندو فلسفہ کے ماہر تھے۔ شام کے وقت انہی پنڈت صاحب کے ساتھ جلسہ جمتا تھا۔

ایک دن پنڈت جی کہنے لگے کہ اسکول و کالج کے زمانہ میں ہوش سنبھالنے کے بعد تقریباً چھ سات سال مسلمان دوستوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے مگر جب بھی مذہب کے متعلق گفتگو ہوئی اور میں نے اسلام کے متعلق اپنے شکوک و وساوس کا اظہار کیا جو معاندانہ نہ تھا بلکہ میں سمجھنا چاہتا تھا تو کسی سے کوئی معقول جواب نہ مل سکا بلکہ نتیجہ میں کچھ بے لطفی سی پیدا ہو گئی۔ بالآخر میں نے ایسا تذکرہ کرنا ترک کر دیا۔

پنڈت جی کی اس تقریر سے مجھے کچھ ناگواری محسوس ہوئی اور بالکل غیر ارادی طور پر کہنے لگا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ مسائل دینی کے اغراض و علل ظاہر کر سکے یا شکوک و وساوس کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ آپ کے ذہن میں اسلام کے متعلق جو اعتراضات ہوں، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ خواہ کیسے ہی الفاظ استعمال کریں، مجھے ناگواری کا احساس نہ ہوگا اور اپنی بساطِ علم و فہم کے مطابق آپ کی تسکین کر دینے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ سن کر پنڈت جی خوش ہو گئے اور کئی ہفتے تک ان سے سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ وہ ایک اعتراض پیش کرتے تھے جس کا جواب سننے کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا۔ جہاں تک یاد ہے تقریباً چھ اعتراضات پر گفتگو ہوئی۔

جس وقت پنڈت جی سے یہ بات چیت ہوئی تو رات کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ لہٰذا بات کل پر رکھی گئی اور جلسہ برخاست ہو گیا جب میں خواب گاہ میں پہنچا تو خیال

آیا کہ یہ میں نے کیا کیا، اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوالات کریں۔ مجھے دین کے متعلق کچھ علم نہیں میں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم نہیں پائی۔ اگر خدانخواستہ معقول جواب نہ دے سکا تو یہ دین کی سبکی ہوگی۔ میں نے یہ کیا کر لیا۔ اس خیال سے ہی قلب میں لرزہ پیدا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل سے یہ دعا نکلی: "مولا تیرا دین ہے۔ تو ہی اس کی نصرت کرے گا۔ مجھ جاہل نادان سے غلطی ہوگئی ہے۔ اب سنبھالنے والا تو ہی ہے۔"

بس تھوڑی دیر میں دل میں قوت پیدا ہوگئی اور سکون ہوگیا۔ دوسرے دن پنڈت جی سے گفتگو شروع ہوئی۔ پنڈت جی کے ہر سوال پر دل میں تڑپ پیدا ہوتی تھی۔ مالک سے نصرت طلب کرتا تھا اور فوراً جواب ذہن میں آجاتا تھا۔

الغرض دوسرے دن شام کو جب جلسہ جما تو میں گھبرا رہا تھا۔ توجہ مالک کی طرف تھی۔ خیال آتا تھا۔ کہاں ایک فلاسفی کا گریجویٹ اور کہاں ایک معمولی پڑھا لکھا تقریباً جاہل۔ مگر اب قدرت خدا کا تماشا دیکھیں اور رب کا شکر بجا لائیں کہ اس نے ایک نادان جاہل کے ذریعہ سے اپنے دین کی تائید فرمائی۔ غرضیکہ جب پنڈت جی اطمینان سے بیٹھے تو سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔

پنڈت جی کا پہلا اعتراض

پنڈت جی کہنے لگے :-

"میں نے اکثر مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ وحشی اقوام کے عقائد کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بچے کی فطرت تو صحیح ہوتی ہے مگر ماں باپ اس کو خلافِ فطرت عقائد کی طرف تاویلات باطلہ سنا سنا کر راغب کر لیتے ہیں۔ ایک مثال تو ہمارے سامنے امیر علی ٹھگ کی موجود ہے۔ جو میں نے "ٹھگ کے اعتراف جرم (confession of a Thug) میں دیکھی کہ اس کے ماں باپ کو ٹھگوں نے قتل کر دیا تھا اور بچے کو خود پرورش کیا۔ جب وہ کچھ سمجھنے کے لائق ہوا تو ایک روز اپنے مفروضہ باپ سے کہنے لگا:

"بابا ہم تو مسلمان ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں پھر ہمارے یہاں آدمیوں کو مار ڈالنے اور ان کا مال چھین لینے کا کام کیوں ہوتا ہے۔ یہ کام تو اچھا نہیں ہے۔"

باپ نے کہا "دیکھو اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ آدمی تو ہے نہیں جو خود کام کرے۔ اس کے سارے کام بندوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں وہ ہی بیماروں کو شفا دیتا ہے۔ یہ کام طبیبوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ وہ رازق ہے تو اناج کاشتکاروں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کا مظہر انسان ہی ہے۔ اب یہ آدمی کا کام ہے کہ وہ جس صفت کا مظہر بننا چاہے بن جائے۔ تو اللہ تعالیٰ قہار بھی ہے۔ وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ ہم نے اس کی صفت قہاری کا مظہر بننا پسند کیا۔

پس اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو مارنا چاہتا ہے۔ ہم اس کا ذریعہ اور واسطہ ہو جاتے ہیں۔ بتاؤ اس میں کیا خرابی ہے؟" یہ سن کر اس بچہ کو تسلی ہوگئی۔

بعض وحشی اقوام کے عقائد بھی معلوم ہوئے۔ مشرقی بنگال کے پہاڑی علاقوں میں کچھ قبائل آباد تھے۔ ان کے یہاں ہر تیسرے سال انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مریا قوم کے آدمی کی قربانی دیوتاؤں کو بہت زیادہ پسند ہے۔

چنانچہ وہ مریا قوم کے ایک آدمی کو موقع پا کر پکڑ لاتے۔ اس کو خوب آرام سے رکھتے۔ عمدہ غذائیں کھلاتے اس کے سر کے بال بڑھائے جاتے۔ جب بال خوب لانبے ہو جاتے تو ایک دن قربانی کا مقرر کیا جاتا۔ دیوتاؤں کے مندروں کے پجاری جمع ہوتے۔ بڑا پجاری ان سے ایک گڑھا کھدواتا جس کے ایک کنارے پر ایک لکڑی گاڑ دی جاتی۔ پھر گاؤں کے سب مرد، عورتیں جمع ہوتے اور دیوتاؤں کے لئے ڈھول بجا بجا کر گانا اور ناچ شروع ہوتا اور قربانی کے آدمی کو سر کے بالوں سے لکڑی پر باندھ کر لٹکا دیا جاتا۔ پھر بڑا پجاری منتر پڑھ پڑھ کر لٹکے ہوئے آدمی کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹتا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ قربانی کا آدمی جتنا زیادہ چلائے گا اور تڑپے گا، دیوتا اتنے ہی زیادہ خوش ہوں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہمیں برکت دیں گے۔ اسی لئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کاٹے جاتے۔ جب تمام گوشت جسم سے اتار لیا جاتا تو سر کاٹ کر ہڈیاں اس گڑھے میں دبا دیتے۔ گوشت کے ٹکڑے سب آدمیوں پر تقسیم کر دیتے۔ وہ ان کو برکت کے لئے اپنے کھیتوں میں دبا دیتے اور

سر گاؤں کے سوا نہ پر دفن کیا جاتا تاکہ گاؤں بلاؤں سے محفوظ رہے۔

ایسے فاسد اور بے عقلی کے عقائد کو جہلا۔ دین و مذہب سمجھ لیتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمشکل اس قربانی کو بند کرایا۔

مذہب حق تو وہی ہوگا جو خدا کی طرف سے ہو۔ سچا دھرم تو دیا دھرم ہے۔ ہم تو گیان[1]، دھیان[2]، بھگتی[3] کو خدا کا دین جانتے ہیں۔ اس کو تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ جو مذہب خدا کی طرف سے ہوگا، صفات حسنہ کی تعلیم دے گا۔ رحم و کرم، شفقت علی الخلق سکھائے گا۔ اس سے کوئی فردِ بشر انکار نہیں کر سکتا کہ زیر دستوں پر مہربانی کرنا فریضۂ انسانیت ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ بے زبان جانوروں سے اچھا سلوک کرے، ان کو سیر و سیراب رکھے۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لے۔

اگر اس اصول انسانیت پر عوام عمل نہیں کرتے تو حکومتیں ایسا قانون بناتی ہیں جو جانوروں پر ظلم کرنے سے روکے۔ مگر مسلمانوں کے حال پر حیرت ہوتی ہے کہ بے زبان جانوروں کو بیدریغ ذبح کر کے حصولِ ثواب کی تمنا کرتے ہیں۔

اسلام کو خدائی مذہب کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی سال میں ایک دن مقرر کر رکھا ہے کہ اس روز ہر مسلمان وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرے اور بے زبان جانوروں کو ذبح کر کے ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھ کر تقرب خداوندی حاصل کرے۔

ہندوؤں میں بھی بعض وحشی تو یں دیوی دیوتاؤں کے لئے

---

[1] گیان۔ معرفت [2] دھیان یکسوئی توجہ مراقبہ [3] بھگتی، خدمت خلق

جانوروں کی قربانی کرتی ہیں جس پر مسلمان ان کو خونی دیوتا کہہ کر مضحکہ اڑاتے ہیں، مگر اپنے ارحم الراحمین خدا کو نہیں دیکھتے کہ ہر سال ہزاروں قربانیاں مانگتا ہے۔ ہندوؤں کے دیوی دیوتا تو چند قربانیوں کی وجہ سے خونی دیوتا کہلائیں مگر مسلمانوں کا خدا بے شمار جانوروں کا خون زمین پر بہتا دیکھ کر خوش ہونے کے باوجود ارحم الراحمین ہی رہے۔ واہ صاحب واہ! کیا پاکیزہ مذہب ہے اور کیسے با فہم اہل مذہب ہیں؟ ؎

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا"

الجواب بعون الوہاب

پنڈت جی کی طول طویل فلسفیانہ تقریر کے دوران میرے ہوش وحواس تو ضرور گم ہوتے رہے مگر مالک کی طرف خلوص سے لو لگی رہی۔ پنڈت جی کی تقریر ختم ہوتے ہی زبان کھل گئی۔

اب میری باری تھی۔ میں نے کہا، کوئی معقول انسان ایسا نہیں ہو سکتا جو اس سے انکار کر سکے کہ رحم و کرم اور شفقت علی الخلق ہی صفات انسانیت ہیں۔ جب تک آدمی میں یہ صفات پیدا نہ ہوں، انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ جب یہ مانی ہوئی سچائی ہو تو مذہب پر بھی اسی کلیہ کی روشنی میں نظر ڈالنی ضروری ہے اور یہی صداقت کی کسوٹی ہے۔ اس لئے کہ مذہب اسی راستے کو کہتے ہیں جس پر چل کر آدمی جو اپنی خواہشات و جذبات کی تسکین میں بہائم کی مثل زندگی گزارنے کے سبب چوپاؤں سے بدتر ہے، بلند ہو سکے اور ہوا و ہوس پر غلبہ حاصل کر کے منزل انسانیت میں داخل ہو کر مخلوقِ

خدا کے لئے رحم و کرم، شفقت و محبت کا مجسمہ بن سکے۔

اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قربانی عید الاضحیٰ پر بھی نظرِ غائر ڈالنی ضروری ہے مگر اس کے لئے بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ظاہر بینوں کو تو یہ عمل وحشت و بربریت کا مظاہرہ معلوم ہوتا ہے مگر ممکن ہے، اس کا مقصد رحم و کرم اور شفقت علی الخلق کی حفاظت ہو اور یہ دیا و دھرم کی بقا اور صیانت کے لئے کیا جاتا ہو۔

آیئے اس پر گہری نظر ڈالیں اور نفسیاتی راز تلاش کریں۔ اس کے لئے پہلے فطرتِ انسانی کا مطالعہ ضروری ہے۔

بچے کو دیکھئے اپنے ہم سن کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ کھیلے، اس سے بات چیت کرے۔ اگر ساتھ کھیلنے والا کوئی بچہ نہیں ہوتا تو گھبراتا ہے۔ گھر والوں کو تنگ کرتا ہے۔ تلاشِ رفیق اور ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اس کی فطرت ہے بلکہ یہ جذبہ قریب قریب تمام چوپاؤں، چرندوں، اور پرندوں میں بھی موجود ہے۔

بہت عرصہ ہوا کہ ایک روزنامہ میں ایک مضمون زیرِ عنوان "تلاشِ رفیق" شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے اپنے مشاہدات سے اس کا ثبوت پیش کیا تھا کہ طیور و بہائم میں بھی یہ جذبہ موجود ہے۔ اصل مضمون من و عن تو یاد نہیں البتہ اس کا لب لباب اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

مضمون نگار نے لکھا تھا کہ میرا مکان ایک بڑے تالاب کے نزدیک واقع تھا۔ میں روزانہ شام کو اس کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔ تالاب میں راج ہنس کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ کسی شکاری نے ایک روز اس جوڑے میں سے ایک کو شکار کر لیا۔ دوسرا نہایت مضطرب و پریشان چیختا پھرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فریاد و فغاں کر رہا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ اس کے چلانے سے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔

چند روز یہی کیفیت رہی۔ پھر ایک روز سکون ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ خوش خوش اسی طرح پھر رہا ہے۔ جیسے اپنے جوڑے کے ساتھ پھرا کرتا تھا۔ اب مجھے اس کی جستجو ہوئی کہ اس کی تسکین کا کیا سبب ہے؟

بالآخر ایک روز دیکھا کہ ایک بڑی مچھلی اس کے ساتھ ہے۔ جس طرف وہ جاتا ہے، اسی طرف مچھلی بھی جاتی ہے اور اگر مچھلی اپنا رُخ بدلتی ہے اور کسی دوسری سمت کو چل پڑتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اسی سمت کو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ اس نے اس مچھلی کو اپنا رفیق بنا لیا ہے جس سے اس کو سکون مل گیا۔

ایک روز ایک شخص مچھلی کے شکار کے لئے تالاب پر آیا اور کانٹا ڈالا۔ اس وقت میں بھی تالاب کے کنارے بیٹھا تھا۔ اتفاق سے وہ ہی مچھلی کانٹے میں پھنس گئی جب ڈور کھینچنی شروع کی تو میں نے دیکھا، راج ہنس بھی مچھلی کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔ جب مچھلی کنارے پر آگئی اور اس کو باہر کھینچنا چاہا تو راج ہنس نے شکاری پر حملہ کر دیا۔

یہ دیکھ کر میں نے شکاری کو تمام حالات سنائے اور سفارش کی کہ اس مچھلی کو چھوڑ دے ورنہ یہ راج ہنس پھر فریاد و فغاں کرنے لگے گا۔ اس کی فریاد ہم سے سنی نہیں جاتی جب یہ فریاد کرتا ہے تو میرے گھر کے سب لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ پس میری خوشامد کرنے پر اس نے کانٹا نکال کر مچھلی کو چھوڑ دیا۔ راج ہنس بہت خوش ہوا اور مچھلی کے ساتھ ساتھ تیرتا چلا گیا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا صرف یہی مقصد تھا کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ تلاش رفیق کا جذبہ حیوانات میں بھی موجود ہے انسان بھی تنہائی سے گھبراتا ہے اور ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔

لہٰذا بستیاں، قصبے اور شہر آباد کرتا ہے اور آبادی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ جب بہ کثرت افراد یکجا ہو جاتے ہیں تو خواہش تمدن کی تسکین ہو جاتی ہے۔ پھر دیگر خواہشات و

جذبات کی تسکین میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوسرے ہم جنسوں کی خواہشات وجذبات کا خیال رکھے بغیر اپنے خواہشات وجذبات کی تسکین اور اپنے اغراض کی تکمیل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مال و دولت کی محبت اندھا کر دیتی ہے۔ دوسروں کو نقصان پہونچا کر اپنی ہوس کی تشفی کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا اور یہی باعث فساد ہے۔

ان مظالم ومفاسد کو رد کنے کے لئے ایک قوی نظام کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ طاقتور کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکا جائے اور زیادتی کرنے والوں کو سزا دی جاسکے اگر ہر شخص میں رحم وکرم، شفقت علی الخلق، ایثار وہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں اور اتنے قوی ہوں کہ دوسرے جذبات سے مغلوب نہ ہو سکیں تو ہمیشہ امن قائم رہے اور کسی قوی نظام حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ہر شخص آزادی اور سکون سے زندگی گزار سکے مگر دنیا میں بلند اخلاقی کے حامل اور دیاوھرم پر حامل شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ کثرت ان افراد کی ہے جو خود غرض، طامع، حاسد اور عیش پرست ہیں۔

ہر شخص کا جذبہ راحت پسندی اس کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ خوب دولت جمع کرے۔ تاکہ آئندہ زندگی میں محنت ومشقت سے محفوظ رہ کر عیش وعشرت میں زندگی بسر کر سکے۔ جذبۂ انانیت اس کو نام ونمود، عزت وشہرت وجاہت ظاہری کے حصول کی کوشش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اہل دولت کو اس کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے مال ودولت صرف بھی کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر تکلیف بھی اٹھاتے ہیں اور اسطرح ایک خاص گروہ میں وقعت حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ اس ظاہری ایثار وخدمت خلق میں بے غرضی اور خلوص نہیں ہوتا۔ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے میں ناکام ہی رہتے ہیں۔ عوام کے دلوں کو تو وہی مسخر کر سکتا ہے جس کو نام ونمود کی خواہش نہ ہو بلکہ اس کا مقصد ہی خدمت خلق ہو۔ اس کے معاوضہ میں نام ونمود، عزت و

شہرت یا شکر گذاری کا خواستگار نہ ہو۔

پس اگر کسی بستی میں ایک معمولی حیثیت کا شخص بے غرضانہ خدمتِ خلق میں معروف رہے تو لازمی ہے، اس کی عزت و شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرلے گا۔ ہر شخص اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آئے گا مغرور، خود پسند امراء کے مقابلہ میں اکثر افراد اس کو ترجیح دیں گے خبیث النفس امراء کو حسد پیدا ہوگا۔ اس کو نقصان پہونچانے، کسی معاملہ میں پھنسا کر ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اگر سوء اتفاق سے کوئی ایسا معاملہ پیش آگیا جس میں کسی شئے یا جگہ کی ملکیت کے متعلق کسی مغرور رئیس کو اس شخص سے تنازعہ کرنے کا موقع مل گیا اور رئیس مذکور نے اس پر تشدد کرنا چاہا تو عوام کی اکثریت اس مخلص خادم کا ساتھ دے گی اور رئیس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ جو اس کی آتشِ حسد و عداوت کو بھڑکانے کا سبب ہوگا۔ اور اس غریب کی ایذاء رسانی پر آمادہ ہو جائے گا۔

ہو سکتا ہے اپنی آتشِ حسد کو بجھانے کے لئے اس کے قتل کے منصوبے سوچنے لگے۔ اب فرض کریں یہ دولت مند کچھ شریر النفس بد معاشوں کو مال و دولت کا لالچ دے کر ان کے دین و ایمان کو خرید لے اور اس نیک نفس، خادم خلق کے مکان کو لوٹ لینے اور اس کو قتل کر دینے پر آمادہ کرلے۔

پس جس وقت یہ حملہ آور اس کے مکان میں داخل ہوں تو اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ کیا اپنے کو ان کے حوالے کر دے؟ ہر شخص یہی فیصلہ کرے گا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے کو دشمن کے حوالہ کر دینا ذلت و خواری ہے حتی الامکان اپنی حفاظت کرنا لازمی ہے بد معاشوں پر اس کو بھی حملہ کرنا چاہیئے۔ ایک دو کو تو زخمی کر ہی دے گا اور ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ہلاک بھی ہو جائے اور سب راہ فرار اختیار کریں۔

اب آپ بتلائیں کہ صاحبانِ انصاف میں سے کوئی شخص اس غریب مخلص خادم کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے؟ اس پر پنڈت جی کہنے لگے "ہرگز نہیں، ایک منصف کے لئے اس کے خلاف کچھ کہنا ممکن نہیں"۔

میں نے کہا پنڈت جی ایک مشکل یہ پیش آئے گی کہ جس شخص نے ہمیشہ رحم و کرم اور شفقت علی الخلق میں عمر گذاری ہو اس کے لئے ان حملہ آوروں پر ہتھیار اٹھانا کیسے گوارا ہو گا اور اگر دل مضبوط کر کے کسی پر وار کر بھی دیا اور خون کی دھار اچھلی تو اس کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کیسے قائم رکھ سکے گا۔ جس شخص نے کبھی خون کی دھار اچھلتے، کسی کو زخم کھاتے دیکھا ہی نہیں، وہ حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کیسے کر سکتا ہے۔

دیکھئے اسپتالوں میں سرجنوں کے ساتھ جو ملازمین اپریشن روم میں کام کرتے ہیں ان کو کافی مدت اس پر صرف کرنا پڑتی ہے کہ اعضائے جسم کو کاٹتے چھانٹتے اور خون بہتا دیکھنے کی عادت ہو جائے ورنہ جس شخص کو عملِ جراحی دیکھنے کی عادت نہیں ہوتی، اس کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اسی لئے اپریشن کے وقت صرف وہی ملازمین اپریشن روم میں رہتے ہیں جن کو چیر پھاڑ کا عمل دیکھتے رہنے کی عادت ہو چکی ہو۔

اس بات کو تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ نفسِ انسانی میں خون کی دھار اچھلتے دیکھ کر غیر متاثر رہنے کی اہلیت بہ تدریج پیدا ہوتی ہے۔ دفعتاً ایسا بن جانا ممکن نہیں۔

اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور پھر اصل مطلب کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ میں ایک خادم خلق کی مثال پیش کر چکا ہوں، اگر بدمعاش اس کو قتل کر دیں، اس کا اسباب لوٹ لیں، مکان جلا دیں اور یہ مقدمہ دیا دھرم کی عدالت میں و یا لو جج صاحبان کی پوری بنچ کے سامنے پیش کیا جائے تو سب بالاتفاق یہی فیصلہ صادر کریں گے کہ شریر النفس قاتلوں کو سخت عذاب دے کر ہلاک کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور خادمانِ خلق محفوظ اور مصؤن رہ سکیں۔

پس اگر قوی نظامِ حکومت قائم ہے تو یہ کام حکومت انجام دے گی اور اگر کوئی مضبوط حکومت موجود نہ ہو تو بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس لئے شریر النفس بدمعاشوں کی جماعت کا مقابلہ کرنا جن کی حمایت پر ایک متمول صاحب وجاہت ہو بغیر جماعتِ کثیر ممکن نہیں، گروہ کا مقابلہ گروہ ہی کر سکتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے اشخاص جو رحم و کرم اور دیا دھرم کی بقا چاہتے ہوں مجتمع ہو جائیں اور بانیانِ فساد سے انتقام لیں اور ان کو کرار واقعی سزا دیں مگر اس کام کے لئے وہی لوگ آمادہ ہوں گے جن میں قربانی کا جذبہ ہو اور ان کے نفسوں میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ خون کی دھار اچھلتی دیکھ کر غیر متاثر رہ سکیں۔

میں نے ایک کریم النفس بزرگ کو خود دیکھا ہے کہ ایک بدمعاش ان سے برسرِ پرخاش ہوا۔ ان کو نقصان پہنچانے کے لئے ان کے قریب گیا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے۔ اس بزرگ نے ایک خاردار لکڑی بدمعاش کے سر پر دے ماری۔ وہ زخمی ہوا، خون کی دھار اچھلی تو اس کو دیکھ کر بزرگ موصوف کو چکر آگیا۔ قریب تھا کہ گر جاتے حسنِ اتفاق کہ اسی وقت ان کے چند اعزہ و ملازمین مکان میں داخل ہوئے اور ان کو دیکھ کر دوڑ پڑے۔ کسی نے ان کو سنبھالا۔ دوسروں نے بدمعاش کو قابو میں کر لیا۔ اگر اس وقت اور لوگ نہ آگئے ہوتے تو یہ بدمعاش ان کو سخت نقصان پہونچا سکتا تھا۔ یہ بزرگ کبھی کسی جانور کو ذبح نہ کرتے تھے بلکہ اپنی عمر میں کبھی ایک مرغ بھی ذبح نہ کیا تھا۔

ان تمام معروضات سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ ہر اس شخص کے لئے جو رحم و کرم اور شفقت علی الخلق اور دیا دھرم کا حامی ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ دیا دھرم کی حفاظت کے لئے اس کے نفس میں یہ اہلیت بھی ہونی لازمی ہے کہ خون کی دھار اچھلتے دیکھ کر، اعضاءِ جسم کٹتے دیکھ کر، لاشوں کو تڑپتا دیکھ کر ہوش و حواس قائم رکھ سکے، اور یہ اہلیت بغیر مشق کے نہیں ہو سکتی۔ جب تک عادت نہ ڈالی جائے یہ اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اب صاحبانِ انصاف خود ہی فیصلہ کریں کہ نفسِ انسان کو یہ مشق کیسے کرائی جائے کیا اس کے لئے انسانوں کو تختہ مشق بنایا جا سکتا ہے؟

پس اگر رحم و کرم، شفقت علی الخلق اور دیا دھرم کی حفاظت کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے کچھ جانور ذبح کر دئے جائیں تو اس کو ظلم و بربریت سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی لئے اسلام نے ہر مسلمان پر عید الاضحیٰ میں ایک جانور قربان کرنا لازم کر دیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔

پھر دفع فساد اور قیام امن کے لئے وہی لوگ آمادہ ہو سکتے ہیں جن میں مالی قربانی کا جذبہ بھی ہو اور مالِ حلال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہوں۔ اس قربانی سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ مالی قربانی کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔

احکامِ قربانی میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ گردن جدا نہ کی جائے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم بھی حکمت پر مبنی ہے۔ اعضاءِ جسم کے تمام کاموں کا تعلق اعصاب سے ہے اور اعصاب کا تعلق حرام مغز سے ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور گردن میں ہے۔ اگر گردن کی رگیں کاٹ دی جائیں اور پیچھے کی ہڈی قائم رہے تو قلب کی حرکت کچھ دیر قائم رہتی ہے اور حرکت جاری رہنے تک شریانوں سے خون خارج ہوتا رہتا ہے۔ اگر گردن جدا کر دی جائے تو قلب کی حرکت فوراً بند ہو جائے گی اور ذبیحہ کی بہ نسبت بہت کم مقدار خون کی خارج ہو گی۔

خون کھانے سے شقاوت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ذبح کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ مقدار خون کی خارج ہو سکے۔ جس کی بہترین صورت یہی ہے کہ گردن کی رگیں کاٹ دی جائیں اور سر جدا نہ کیا جائے۔ جھٹکے اور ذبیحہ کے گوشت کے رنگ میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ان ہی اسباب سے جھٹکے کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے۔

پنڈت جی یہ سن کر خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے۔ میں نے کہا، آپ حضرات کو عیدالاضحیٰ کی قربانی پر ناگواری کا احساس محض گائے کی قربانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ورنہ کالی مائی اور اکثر دیوی دیوتاؤں کے لئے جانوروں کی قربانیاں بعض اہل ہنود بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی طرف نظر نہیں جاتی۔

اب فرمایئے، آپ کی تشفی ہوئی یا نہیں یا اب بھی آپ کو اس پر اعتراض باقی ہے۔ کہنے لگے جواب معقول ہے۔ تو بندہ نے عرض کی یہ جواب تو آپ کی تسلی کے لئے ہے ورنہ یہ قربانی تو ایسی عظیم قربانی کی یادگار ہے جو حق و صداقت کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کے جذبات قلوب میں پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کی یادگار قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے ایک عرصہ تک کچھ ذکر نہ کیا۔ ایک روز کہنے لگے "کیا میں اور سوال کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا، شوق سے جو چاہیں سوال کریں۔ میں آپ کے ہر اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سننے کو تیار ہوں اور اپنی بساط فہم و علم کے مطابق جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

دوسرا اعتراض

پنڈت جی نے کہا:۔

"قرآن کریم کو آپ خدا کا کلام کہتے ہیں حالانکہ وہ آپ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ملا ہے۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہو گیا؟ اگر آپ کے پاس کوئی معقول دلیل ہو تو پیش کریں۔"

الجواب بعون الوهاب

بندے نے کہا، پنڈت جی آپ ہندو فلسفہ کے ماہر ہوتے ہوئے ایسا سوال کریں تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔

دیکھئے۔ جب کوئی شخص گیان حاصل کرنے کے لئے دھیان لگانے کی مشق کرتا ہو تو کیا چند سال میں وہ اس کیفیت کو نہیں پہونچ سکتا کہ جب دھیان لگاکر بیٹھے تو دنیا و مافیہا اور خود اپنے سے بھی بے خبر ہو جائے۔ بتلائیے کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

پنڈت جی نے کہا، "اگر اہلیت ہو گی تو اس پر ایسا ایک وقت ضرور آجائیگا"

میں نے کہا کہ "اب آپ ہی بتلائیں کہ ایسے استغراق کی حالت میں جو بات اس کے دل پر اترے گی، وہ کس کا کلام ہوگا، دھیان لگانے والے کا یا اس کا جس کا دھیان ہے؟"

اب پنڈت جی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ "وہ کلام دھیان لگانے والے کا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسی ذات کا ہوگا جس کی طرف دھیان لگایا ہوا ہے"

میں نے کہا، "بس ایسی حالت میں جو کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اترا اسی کو ہم کلام اللہ مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور باتوں کو قول رسول یا حدیث کہتے ہیں۔

نزولِ وحی یا کلام اللہ کے دل پر اترنے کے وقت رسول پاک کی ایسی کیفیت ہو جاتی تھی کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے اور بے ہوشی سی طاری ہو جاتی، پیشانی مبارک پسینہ میں غرق ہو جاتی۔ اس کیفیت کے طاری ہونے کے بعد جب ہوش میں آتے تو فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ اس کو لکھوا دیتے۔ ایسا تمام کلام قرآنِ

شریف میں جمع کر لیا گیا ہے۔ اسی کو تمام اہل اسلام کلام اللہ کہتے ہیں اور حقیقتاً وہ کلام اللہ ہی ہے۔

یہ سن کر پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اس پر کوئی اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔

تیسرا اعتراض

پھر ایک روز پنڈت جی کہنے لگے کہ:۔

"ایک وسوسہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا دعوےٰ ہے کہ اسلام تمام دنیا کے لئے ہے تو اللہ پاک نے قرآن عربی میں کیوں نازل کیا۔ کیا اللہ پاک کی زبان بھی عربی ہی ہے؟ اس کے سوا کیا اور زبانیں نہیں جانتے؟"

الجواب بعون الوھاب

بندہ نے عرض کی پنڈت جی یہ اعتراض تو خواہ کوئی سی بھی زبان ہو۔ ہر زبان پر ہو سکتا ہے مگر میں ٹالنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تفصیلی جواب پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ذرا غور کیجئے اور سوچ کر بتلائیے کہ جو خیال یا خواہش آپ کے ذہن یا دل میں پیدا ہوتی ہے وہ الفاظ میں ہوتی ہے یا اُس کا اصل مفہوم ہوتا ہے، جس کو آپ اپنے لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

کہنے لگے کہ "نہیں کوئی خیال یا خواہش لفظوں میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل مفہوم ہوتا ہے۔ بس کیا کہوں اس کے ظاہر کرنے کو میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔ یہ تو نفس کے باطن کی کیفیت ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہیں نے کہا، بس اصل قرآن وہی اصلی مفہوم ہے جو قلب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو لفظوں میں ظاہر فرمایا۔ دیکھئے ہر شے کے چار وجود ہوتے ہیں:۔

۱۔۔۔۔۔۔ وجودِ ذہنیہ، مثلاً کسی کو آفتاب کا خیال آیا۔ اس کے ذہن میں آیا آفتاب۔ یہ وجود ذہنی ہے۔

۲۔۔۔۔۔۔ وجودِ ملفوظیہ، مثلاً کسی نے کہا "آفتاب" یہ اس کا وجودِ ملفوظی ہے۔

۳۔۔۔۔۔۔ وجودِ مکتوبیہ، کسی نے اگر لکھا "آفتاب" یہ اس کا وجودِ مکتوبی ہے

۴۔۔۔۔۔۔ وجودِ حقیقیہ، اصل آفتاب خود ہی اپنا وجودِ حقیقی ہے۔

پس ایک قاری جب کسی آیت کو دیکھتا ہے اور تحریرِ قرآنِ کریم پر نظر کرتا ہے تو جو کچھ اس کے ذہن میں آتا ہے وہ وجودِ ذہنی ہے جب تلاوت کرتا ہے تو جو آواز منہ سے نکلتی ہے وہ وجودِ ملفوظی ہے۔ جو کچھ اوراق پر لکھا ہوا ہے وہ وجودِ مکتوبی ہے۔

اب اصلی اور حقیقی قرآن کہاں ہے؟ اس کو خود قرآنِ کریم ہی بتلاتا ہے:۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ	بلکہ وہ تو واضح نشانیاں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جن کو علم دیا گیا۔
(پ۲۱۔ ع۱)	

قرآن کریم کا حقیقی مفہوم وہی جانتے ہیں جو علم میں کامل اور راسخ ہیں جن کو رب نے علم عطا کیا ہوا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی ایک تعریف یہ بھی فرمائی ہے:۔

اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَآءُ	علم تو وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے

لہٰذا حقیقی قرآن جو نور ہے وہ تو ان ہی لوگوں کے سینوں میں اثر انداز ہوگا جن کو

گیان مل گیا ہو۔ (صاحبان معرفت اولیاء اللہ)

اس کے باوجود اللہ پاک نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝
(سورۃ القمر۔ ع ۱)

اور ہم نے قرآن کو بہت آسان کر دیا ہے نصیحت کے لئے۔ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

یعنی نصیحت تو اس سے ہر شخص حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بچہ بھی اس سے نصیحت پا سکتا ہے۔

چوتھا اعتراض

پنڈت جی کہنے لگے:۔

"ایک مہا گیانی (صاحب معرفت کامل) کے لئے تو ہر زبان میں مطالب کا اظہار ممکن ہے۔ ایک مہاگیانی کو کوئی زبان یا علم کسب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب مہاگیانی تھے تو قرآن صرف عربی ہی میں کیوں رہا، کسی اور زبان میں بھی کیوں نہ لکھوایا؟ جب بقول اہل اسلام وہ تمام دنیا کے لئے ہے اور ان کے رسول ساری دنیا کی ہدایت کے لئے تھے۔

الجواب بعون الوهاب

عرض کیا یہ تو آپ کا عجیب سوال ہے۔ عرب میں کسی اور زبان میں کیسے بیان کیا

بتاتا۔ وہاں اور زبانوں کے سمجھنے والے کہاں تھے؟

ممکن ہے کہ اب آپ یہ کہیں کہ اللہ پاک نے نزول قرآن کے لئے عرب ہی کو کیوں منتخب کیا؟ تو اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ جو کچھ میں سمجھ سکتا ہوں، بیان کردوں گا۔ اصل حقیقت تو مالک ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ پاک کا فرمان ہے:۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ — نہیں دیا گیا تمہیں علم مگر بہت تھوڑا

ہمیں تو ایک ذرہ کا بھی علم نہیں۔ علم تو اس وقت کہہ سکتے ہیں جب حقیقت معلوم ہو۔ ہمیں تو ایک ذرہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ میں تو اس علم کو صرف واقفیت سمجھتا ہوں کہ ہمیں تھوڑی سی واقفیت ہے۔ علم تو ظاہر کا ہو یا باطن کا، اسی کے پاس ہے۔ وہی عالم الغیب ہے اور وہی عالم الشہادۃ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے، عالم الغیب والشہادۃ وہ جسے چاہے علم کا نور عطا فرمائے۔

دیکھئے میں اپنے فہم کے مطابق چند وجوہ بیان کرتا ہوں۔ شاید آپ کی تسلی ہو سکے۔

۱ ——— چھٹی صدی عیسوی میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اور بعثت کے وقت عرب کی حالت تمام دنیا میں سب سے زیادہ خراب تھی۔ قتل و غارت، رہزنی، ظلم و تعدی، دغابازی عام تھی۔ قبائل آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ نسلاً بعد نسلاً انتقامی لڑائیاں جاری رہتی تھیں۔ جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی جہالت و بداخلاقی دنیا میں اور جگہ نہ تھی۔ اس لئے جہاں سب سے زیادہ تاریکی تھی، وہیں سب سے زیادہ روشنی کی ضرورت تھی۔

۲ ——— رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرآن کریم یہ بتلاتا ہے کہ ہم نے رسول کو اس لئے بھیجا کہ وہ لوگوں کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور ان کو علم و حکمت سکھلائے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ

(سورہ جمعہ ۔ ع ۱)

وہ وہی ذات اقدس ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا تاکہ ان پر ہماری آیتیں تلاوت کرے اور ان کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور ان کو علم و حکمت کی تعلیم دے۔

یعنی ان کے نفسوں سے لاشعوری (unconsciousness) کی تاریکی دور ہو اور علم و تحقیق حاصل کر سکیں اور ان کو گیان حاصل کرنے کے طریقے سکھائے یعنی معرفت حاصل کرنے کے راستے دکھلائے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بھی فرمایا کہ :۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○

ہم نے تم کو ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

نور رسول کے لئے ضروری تھا کہ نسل انسانی کو عام فیض پہونچائے۔

گیان (معرفت) اور کمالات روحانی کے حصول کی اہلیت تمام انسانوں میں تو ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ دنیا کی کثیر آبادی کو اتنا فیض ہی پہونچ جائے کہ ان کے لئے مادی ترقی کی راہ ہی کھل جائے۔ رحمۃ للعلمین کی مہربانی سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں۔

ذہنی ترقی کا انحصار حریت تفکر پر ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ انسان کے لئے ذہنی غلامی بدترین لعنت ہے جو اس کو ہمیشہ جہالت کی تاریکی اور ذلت کے گڑھے میں ڈالے رکھتی ہے اور اس وقت دنیا کا حال یہ تھا کہ گنے چنے افراد یا خاندانوں نے سب کو غلام بنایا ہوا تھا۔ ذہنی غلامی تمام عالم پر چھائی ہوئی تھی۔ یورپ میں مذہبی عدالتیں (انکویزیشنز) قائم تھیں جن کے حکم سے بے شمار افراد کو ارتداد کے شبہ پر زندہ جلا دیا جاتا۔

بیماری کے لئے کہا جاتا کہ بد روحیں داخل ہو گئیں ہیں۔ اس کا علاج محض جھاڑ پھونک

ؔ ناظرین کی سہولت کے لئے آیات و احادیث درج کر دی گئی ہیں۔

سے کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ان حالات کی کچھ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اس زمانہ کے تاریخی حالات سے واقف ہے۔

نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ جب کسی سے مرعوب ہو جاتا ہے تو اس میں آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جب تک مرعوب عنہ (جس سے مرعوب ہے) اس کے سامنے موجود ہے ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ حریتِ فکر اس کو میسر نہیں ہوتی۔ جس کے بغیر ترقی کرنا محال ہے۔ لہٰذا ان بولتے بتوں کو مٹانا ضروری تھا جنھوں نے تمام عالمِ انسانیت کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا تاکہ عالمِ انسانیت اس سے آزاد ہو کر حریتِ فکر کی نعمت حاصل کر سکے اور اس اہم کام کے لئے ایسی قوم کی ضرورت تھی جو دلیر، شجاع، سخت جان، جفاکش، جنگ جو، صاحبِ عزم، موت سے کھیلنے والی اور تلوار کی دھنی ہو۔

یہ تمام صفات جہالت اور پستی کے باوجود تمام اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ عرب ہی میں موجود تھیں۔ خدا پر ایمان لانے کے اور آخرت کے یقین سے ان کے دماغ روشن ہو گئے۔ موت سے کھیلنا ان کے لئے پہلے ہی کوئی بات نہ تھی۔ ایمان لانے کے بعد تو موت کے شائق ہو گئے۔ ہر مجاہد شوقِ شہادت میں جہاد کے لئے نکلتا تھا۔ اس لئے نزولِ قرآن کے لئے عرب ہی بہترین ملک تھا۔

۲———— ہر زبان میں اکثر الفاظ کئی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "کھویا" کے معنی ہیں "گم کر دیا" اور اس سے مراد وہ ماوا بھی ہے جو دودھ سے بنتا ہے، یا مثلاً آپ کہتے ہیں۔ "اب بولو کیا کہتے ہو؟" اور "یہ پودا بو لو پھر اور کام کرنا"۔ عربی زبان میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ ایک کلمہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اکثر کلمات ایسے ہیں جو ایسے مختلف معانی پر دلالت کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مثلاً ایک "تَوَلّٰی" ہی کو دیکھ لیں۔ اس کے بہت سے معانی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔ محبت کرنا، روگردانی کرنا، حاکم ہو جانا، مالک ہونا وغیرہ۔ لہٰذا راز بیان

کرنے کے لئے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

۴ ــــــ حرکات بدلنے سے اکثر الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ہر زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ملیں گے مگر عربی ایسی زبان ہے جس کے تمام افعال کے مشتقات میں حرکت کی تبدیلی سے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے الفاظ سے آپ خود ہی واقف ہیں۔ مثلاً ــــــ عَالِم (جاننے والا) عالَم (جہان)، معلِّم (سکھانے والا) معلَّم (سکھایا ہوا) اس لحاظ سے بھی عربی ہی سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں راز بیان کئے جا سکیں اور اختصار سے بیان ہو سکے۔ تھوڑے سے الفاظ بہت زیادہ مطالب کو گھیر لیں۔

۵ ــــــ عربی زبان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مضارع کے صیغے حال و استقبال دونوں زمانوں کے لئے بولے جاتے ہیں جیسے تَرٰی کے معنے ہیں۔ دیکھتا ہے تو اور دیکھو گا تو ــــــ یا مثلاً تسیر چلتے ہیں اور چلیں گے۔ یہ بھی راز بیان کرنے کے لئے اچھا ذریعہ ہے۔

۶ ــــــ جب مختلف زبانوں کے لوگ شہروں میں ملتے ہیں۔ آپس میں معاملات ہوتے ہیں تو وہاں کی زبان پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے اور ایک عرصہ میں زبان خالص نہیں رہتی مگر صحرا اور دیہات میں جہاں باہر کے لوگوں سے میل جول نہیں ہوتا، وہاں کی زبان صدیوں تک خالص صورت میں باقی اور تغیر سے محفوظ رہتی ہے۔ عرب کی کثیر آبادی صحرا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی ہے لہذا وہاں اب تک تیرہ سو سال کی قرآنی زبان بغیر کسی تغیر کے محفوظ ہے۔ دنیا میں اس وقت کوئی دوسری زبان ایسی نہیں مل سکتی جس میں تیرہ سو سال میں تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔ اور اپنی اصلی قدیمی صورت میں باقی ہو۔ اس لئے بھی نزولِ قرآن کے لئے عرب ہی بہترین ملک تھا۔

۷ ــــــ اس تمام کے علاوہ اس زبان میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو عربی کے سوائے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی اور وہ علم الاعداد ہے کہ اس کے حروف تہجی

کے ہر حرف کے لئے عدد مقرر ہیں۔ اس علم کے جس کو علم جفر کہتے ہیں خاص قواعد ہیں، جن کے ذریعہ سے کسی عبارت کے اعداد نکال کر ان سے حسب قواعد اور عبارتیں بن جاتی ہیں۔

قرآن کریم ہی سے ہے کہ "اس میں ہر شے کا بیان ہے"۔ ایک آیت میں ہے۔ کوئی خشک تر ایسا نہیں جس کا اس کتاب میں ذکر نہ ہو۔ ایسی ہی کئی آیات ہیں۔ پس ظاہراً قرآن میں ہر شے کا ذکر نظر نہیں آتا، البتہ باطن میں موجود ہے۔

اعداد کے ذریعہ سے علم جفر کا ماہر ہر شے کے متعلق معلومات کا استخراج کر سکتا ہے۔ اس علم کے جاننے والے چند صدی قبل تو کہیں کہیں شاذ و نادر پائے جاتے تھے، مگر افسوس کہ اب قریب قریب مفقود ہو گئے ہیں۔ اگر کہیں ایک آدھ ہو گا بھی تو وہ ظاہر نہیں کرتا۔

اب فرمایئے کہ عربی سے بہتر تو کیا اس کی مثل بھی کوئی دوسری زبان قرآن کے لئے موزوں ہو سکتی تھی؟

یہ سن کر پنڈت جی خاموش ہو گئے اور بہت دیر تک غور و فکر میں غرق رہے، بہت دیر سوچنے کے بعد بولے "اب تو آپ نے کچھ اور وساوس پیدا کر دیئے۔ اب تو وقت نہیں پھر کسی روز فرصت میں گفتگو ہو گی۔

پانچواں اعتراض

ایک روز پنڈت جی کہنے لگے۔

"آپ نے جو یہ کہا کہ ہر شے کا علم قرآن میں ہے۔ اس کو سوائے خوش عقیدگی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج یورپ اور

امریکہ دنیا پر چھائے ہوئے نہ ہوتے۔ اگر آپ کا یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر وہ علوم مسلمانوں کو کیوں نہ سکھلائے گئے جن سے آج تک مسلمان دنیا میں سربلند رہتے۔ ایک صاحبِ فہم اس تخیل کو کیسے قبول کرسکتا ہے؟

الجواب بعون الوہاب

عرض کیا کہ پنڈت جی آپکے اس سوال کے دو جز ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ قرآن میں ہر شے کا علم کیسے ہوسکتا ہے۔ دوسرا جزیہ ہے کہ اگر قرآن میں ہر شے کا علم ہے تو وہ لوگوں کو کیوں نہ سکھلایا گیا۔ تو پہلے حصہ کا صحیح جواب تو ایک گیانی (صاحبِ معرفت) ہی دے سکتا ہے۔ اس بندہ حقیر کی کیا بساط مگر آپ کی تسلی کے لئے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔
دیکھئے اگر کوئی ایسا گیانی (صاحبِ معرفت) موجود ہو جس کو تمام قرآن کے ظاہر و باطن کا پورا علم ہو تو کیا کوئی سوال کرنے والا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہر شے کے متعلق سوال کر سکے اور جوابات سننے کے لئے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صرف کر سکے۔ بتلایئے کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ پنڈت جی نے کہا۔ نہیں ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ اور ہر شے کے متعلق سوال بھی تو وہی کرسکتا ہے جو خود بھی ہر شے کا علم رکھتا ہو۔
میں نے کہا ہر سوال کرنے والا دس پانچ چیزوں کے متعلق ہی سوال کرسکتا ہے۔ اب اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر کوئی شخص بعض اشیاءِ عالم کے متعلق ایسے راز ظاہر کردے جن کا جاننے والا اس وقت دنیا میں کوئی نہ ہو اور ان معلومات کے حصول کا کوئی ذریعہ اور وسیلہ بھی موجود نہ ہو تو ـــــــ

ـــــ صدیوں بعد جب معلومات کے وسائل اور آلات پیدا ہوجائیں اور ان کے ذریعہ سے ان اشیاء کے متعلق صحیح حالات معلوم ہوجانے پر صدیوں پہلے بتلائی ہوئی باتوں

کی تصدیق ہو جائے تب تو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس شخص کا علم کسبی نہ تھا بلکہ مالک کی طرف سے تھا یعنی وہبی علم تھا۔ پس اگر وہ یہ بھی کہے کہ مجھے یہ تمام علم قرآن سے حاصل ہوا ہے تو قرآن کی عظمت تو ظاہر ہو ہی جائے گی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب سے زیادہ عالم تھے۔ صحابہ کرامؓ علمی مسائل میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے بھی کتنی ہی مرتبہ مشکل مسائل حل ہونے پر کہا ہے:۔

"اگر حضرت علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا"

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کہا کرتے تھے کہ:۔

"جو تمام علم قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، وہ تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سپرد کر دیا۔ اب مجھ سے پوچھ لو آسمان کے متعلق یا زمین کے متعلق، میں تم کو جواب دوں گا"

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ "اہرام مصر کب بنائے گئے"؟ آپ نے کہا، "تو کون سے اہرام کے متعلق دریافت کرتا ہے"؟ کہنے لگا، "جرمان کے متعلق" حضرت نے فرمایا، "اس پر کوئی تصویر بنی ہوگی وہ کیا ہے"؟ اس نے کہا، "ایک گدھ کی تصویر ہے جس کے منہ میں کیکڑا ہے" حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا، "یہی اس کی تعمیر کی تاریخ ہے۔" بُنِیَ الْجِرْمَانُ النَّسْرُ فِی السَّرْطَانِ (جرمان اس وقت بنایا گیا جب ستارہ نسر برج سرطان میں تھا۔) اس ستارے کا دور آٹھ ہزار سال میں پورا ہوتا ہے اور اب وہ دور پورا کرنے والا ہے۔

۲———ایک شخص نے سورج کی جسامت دریافت کی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا، "نو سو ضرب نو سو فرسخ" جب یہ مقولہ میں نے سنا تو زمانہ حال کی تحقیقات کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ سورج کے قطر کا اندازہ آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل کیا جاتا

ہے۔ اس حساب سے سورج کا محیط ستائیس لاکھ چودہ ہزار میل ہوتا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ اس سے حساب لگایا تو ۹۰۰ × ۹۰۰ فرسخ کے چوبیس لاکھ تیس ہزار میل بنتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد ایک کتاب میں دیکھا کہ فرسخ تین میل شرعی کا ہوتا ہے۔ اور میل شرعی دو ہزار گز کا۔ ایک گز دو ہاتھ یعنی تین فٹ کا۔ دو ہزار گز کے میل کے حساب سے ۹۰۰ × ۹۰۰ فرسخ کے ستائیس لاکھ اکسٹھ ہزار میل ہوتے ہیں جو تحقیقات جدیدہ کے مطابق ہے۔ ستائیس لاکھ میل پر صرف سینتالیس ہزار میل کا فرق ہے۔ یہ کوئی فرق نہیں۔ اس لئے کہ سائنس دان اپنی بتلائی ہوئی جسامت کو اپنا اندازہ کہتے ہیں۔ اس کو صحیح پیمائش نہیں کہتے۔

۳

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے "آفتاب کے ۳۶۰ مشرق اور ۳۶۰ مغرب ہیں" اس راز سے تیرہ سو سال قبل کون واقف تھا۔ ہر روز آفتاب کا مشرق و مغرب بدلتا رہتا ہے اور سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ شمالی کرہ میں ۲۱ جون سب سے بڑا دن ہے اور ۲۱ جون سے ۲۵ جون تک شب و روز میں فرق نہیں ہوتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پانچ دن مشرق و مغرب نہیں بدلتے۔ پس پورے سال میں ۳۶۰ مشرق اور ۳۶۰ مغرب ہی ہوتے ہیں۔

۴

تخلیق نظام شمسی کے متعلق جو خطبات ہیں وہ عربی میں ہیں۔ اگر ترجمہ کرا کے آپ کے سامنے پیش کروں بھی تو آپ کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی مطلب کے مطابق ترجمہ میں کمی بیشی تو نہیں کر لی ہے۔ آپ خود عربی سمجھ نہیں سکتے تراجم کا پیش کرنا بھی ایسا ہی ہوگا جیسے میں خود کہہ رہا ہوں کہ خلقت نظام شمسی کے متعلق جو کچھ خطبوں میں بیان کیا گیا ہے موجودہ سائنسی تحقیقات اس سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو مترجم خطبات کہیں سے حاصل کر کے آپ کو دکھا دوں گا تاکہ میرے قول کی تصدیق ہو جائے۔

ان حالات میں یہ تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مہا گیانی (عارف کامل) ہی ایسی خبریں دے سکتا ہے۔ پس جب ایسا شخص یہ کہتا ہو کہ یہ علوم اس کو قرآن ہی سے ملے ہیں اور یہ کہ قرآن میں تمام علوم موجود ہیں تو لامحالہ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن میں تمام علوم موجود ہیں۔ تب ہی تو ایسا صاحب معرفت اس امر کا مدعی ہے۔

آپ کے سوال کا دوسرا جزء یہ ہے کہ اگر قرآن میں تمام علوم ہیں تو وہ بتلائے کیوں نہیں گئے جن سے مسلمان دنیا میں سربلند رہتے اور اہل مغرب ان سے بازی نہ لے جاتے۔ اس کا جواب تو آپ کے سوال کے پہلے جزء کے جواب کی بہ نسبت بدرجہا سہل ہے۔ جس کا معقول اور مسکت جواب مجھ جیسا جاہل بھی دے سکتا ہے۔

دیکھئے پہلے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اس دنیا کا ہر شخص جتنے بھی علوم وفنون حاصل کرتا ہے جو پیشہ بھی اختیار کرتا ہے۔ دنیا کے کاروبار میں مشقتیں جھیلتا ہے۔ اس کا مقصد منتہیٰ کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ مال و دولت حاصل کرکے اپنے کو اس قابل بنا لوں کہ اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرکے سکون اور پریشانی واضطرار سے محفوظ رہوں اور سکون واطمینان قلب حاصل ہوجاتے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فزکس، کیمسٹری، جیالوجی، باٹنی وغیرہ وغیرہ تمام مروجہ علوم میں سے کسی ایک یا چند علوم میں یا مروجہ فنون میں سے کسی ایک یا چند فنون میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد دولت کثیر جمع کرلینے پر کیا اطمینان قلب (Peace of Mind) کسی کو میسر آسکتا ہے؟ نہیں۔

ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تفکرات ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ دولت جمع ہوتی جاتی ہے اتنے ہی تفکرات بڑھتے جاتے ہیں اور اطمینانِ قلب سے فرد دور ہوتا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ ہی میں جہاں دولت کی ریل پیل ہے، خودکشی کے واقعات دیگر ممالک کی بہ نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تو یہ تھا کہ بنی نوع انسان کو اطمینانِ قلب[1] کی دولت سے مالا مال کر دیں، جو علوم و فنون مادی اور دولت کثیر کے انبار حتّٰے کہ بادشاہت سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اطمینانِ قلب تو فطرت کے ان قوانین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے جن کا تعلق نفسِ انسان سے ہے۔

لہذا رحمۃ للعلمین نے قرآن کریم میں سے صرف وہی اصول فطرت لوگوں کو تعلیم کئے جن سے یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل ہو سکے اور ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے یکسوئی ذہنی لازم ہے۔ علوم مادی محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں، اور نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محسوسات کی طرف ہی راغب ہوتا ہے۔ غیر محسوس اور غیر مرئی عالم (Invisible World) کی طرف توجہ کرنا اس کے لئے نہایت دشوار ہے۔ اپنے باطن کی طرف توجہ کرنا اس کے لئے بہت ہی مشکل ہے۔ پس اگر کچھ علوم مادی ظاہر کر دیئے جاتے تو نفوس انسانی کی تمامتر توجہ ظاہری علوم کی طرف ہو جاتی اور ایک فرد بھی اطمینانِ قلب کی نعمت سے سرفراز نہ ہو سکتا۔

یہ تو ایک سبب ہوا۔ اب ان علوم کے نہ بتلائے جانے کا دوسرا سبب سنیئے۔ علوم مادی کی ترقی سے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں۔ تباہ کن اسلحہ تیار کئے جاتے ہیں۔ آدمیوں کے ہاتھوں میں دوسرے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے اور غلام بنانے کی طاقت بڑھتی ہے۔ انسانیت کی تباہی کے سامان بڑھتے جاتے ہیں۔ دنیائے سائنس کا حال مشاہدہ کر لیں۔ ایک سائنس دان نے لکھا تھا:

"ہم بڑی محنت و مشقت سے ایک نامعلوم کا علم حاصل کرنے کی

---

[1] اسلام اطمینانِ قلب عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ ۱۳۔ ع ۱۰) ایمان والوں کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آگاہ ہو۔ اللہ کی یاد سے ہی اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔

کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ معلوم ہو جاتا ہے تو دوسری نامعلوم سامنے آ جاتی ہیں تب ان کے معلوم کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں جتنی معلومات بڑھتی جاتی ہیں، تباہی و بربادی کے سامان زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ انسان اب ہوا میں اڑنے لگا تو اس کے لئے وسیع کرۂ ارض پر کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ رہی۔ اب اس پر آسمان سے آگ برسنے لگی۔

انسان چونکہ بندۂ جذبات ہے لہٰذا وہ اپنی تمامتر قوت و طاقت اپنے جذبات کی تسکین کے لئے صرف کرتا ہے۔ اگر جذبات عقل فطری سے مغلوب ہو جائیں تو زمین پر فساد نہ پھیلے۔ مگر دنیا کا ہر شخص جانتا ہے اور اس امر کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جس قوم کو مادی طاقت حاصل ہوتی ہے وہ اس کو دوسری کمزور قوموں کو غلام بنانے، ان کے حقوق غصب کرنے اور ضعیف اقوام پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے اور عقل بھی حکم کرتی ہے کہ ایسی طاقتیں کسی فرد کو بھی اس وقت تک نہ دی جائیں جب تک اس میں یہ اہلیت پیدا نہ ہو جائے کہ ان طاقتوں کو کسی حال میں بھی بے جا استعمال نہ کر سکے۔

کیا آپ بچہ کے ہاتھ میں چھری یا پستول دے دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ ہی کو ہلاک کر لے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مادی علوم ظاہر نہ کئے جائیں تاکہ زمین پر فساد نہ پھیلے اور ظلم و تعدی کا طوفان نہ اٹھے۔

تیسرا سبب جس کی وجہ سے علوم مادی کا اظہار انسانیت کے لیے مضر تھا، یہ ہے کہ رسول کریمؐ کی بعثت کا مقصد وحید تو تزکیہ نفس مخلوق[1] ہے۔ لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط (سورہ جمعہ) وہ وہی ذات اقدس ہے جس نے اہل مکہ میں ان میں سے ایک رسول بھیجا تاکہ ان پر اس کی آیات تلاوت کرے اور ان کا تزکیہ کرے اور انہیں علم و حکمت سکھائے۔

فریضہ تو یہ تھا کہ لوگوں کو گیان (معرفت) حاصل کرنے کے طریقے بتلائیں۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جو طاقتیں گیان سے حاصل ہوتی ہیں ان کے مقابل مادی طاقتوں کی کچھ وقعت نہیں۔

صرف ایک مثال ہی دیکھ لیں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمت اللہ علیہ ایک کمبل اوڑھے ہندوستان تشریف لائے اور راجاؤں کی فوجیں اپنی ساری قوتوں کے باوجود اس جگہ سے انکو نہ ہٹا سکیں جہاں انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنی اس عظیم روحانی طاقت سے ملک و مال پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام قوتوں کو خلق اللہ کی خدمت و فائدہ رسانی پر صرف کیا۔ نسل و قوم و مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کو فائدہ پہونچانے میں مصروف رہے مگر کیا بادشاہ و امراء جن کو ہوائے نفس پر غلبہ حاصل نہ ہوا ایسا عمل کر سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

آپ کی قوم کو دا اہل ہنود کو اگر کچھ غم و غصہ ہو سکتا ہے تو ان بادشاہوں کے خلاف جو مال و دولت لوٹتے آتے تھے مگر ان فقراء و درویش صاحبان کو تو ہندوستان کا کوئی شخص بھی خواہ کسی قوم و مذہب کا ہو بھلائی سے ہی یاد کرے گا۔

گیانی کو یہ روحانی طاقتیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب اس کی خواہشات و جذبات عقل فطری سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ احساس فریضہ فطری پیدا ہو جاتا ہے اور کسی قوت کو بے جا استعمال کرنے کی اہلیت باقی نہیں رہتی۔ لہذا لازمی اور ضروری تھا کہ مادی علوم کی طرف لوگوں کو متوجہ نہ کیا جائے۔

اس وقت مجھے سوامی دیانند سرسوتی جی یاد آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو قوم پر انہوں نے بہت بڑا احسان کیا۔ قومیت کا جذبہ بیدار کیا۔ بت پرستی سے روکا۔ نشدھی سے غیر اقوام کے ہندو دھرم میں داخل ہونے کا دروازہ کھولا۔ مگر سناتن دھرم کو سخت نقصان بھی پہونچا گئے کہ ایک انادی (قدیم) کے بجائے تین انادی بنا گئے۔ چونکہ وہ مادی

سائنس کی اس وقت کی مسلمہ تھیوری (نظریہ) سے مرعوب تھے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا بلکہ اشکال بدلتا رہتا ہے لہٰذا انہوں نے مادہ، روح، خدا تین انادی (قدیم) بنا ڈالے۔ اگر وہ گیانی ہوتے تو ایسا کام کرنا ممکن نہ تھا۔ اب ان کا قائم کردہ دین باطل ہو گیا اور دنیا پر ظاہر ہو گیا اور یہ نظریہ دنیا کے سامنے آ گیا کہ مادہ حادث ہے۔ وہ چونکہ گیانی نہ تھے تو کیسے کہتے تھے کہ انبیاء و اوتار ہمیں کیا دے گئے؟ یہ تو معرفت ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیں ایسی نعمتیں دے گئے ہیں جن کے ذریعے سے انسان مادے کا محتاج نہیں رہتا اور پرم آتما کی صفات اس میں جھلکنے لگتی ہیں۔

کیوں پنڈت جی انصاف سے بتلائیں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا، عقل و فطرت کے مطابق ہے یا نہیں؟ پنڈت جی نے کہا کہ:۔

"ہاں بیانات تو معقول ہیں مگر چونکہ یہ مسئلہ آپ کے عقائد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس میں کسی کو دخل دینا نہیں چاہیئے۔ اس لئے میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں۔ اب میں ایک سوال اور دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ میرا آخری سوال ہوگا"

بندہ نے کہا وہ سوال بھی کر ڈالئے۔ کوئی شبہ اور وسوسہ آپ کے دل میں نہ رہ جائے۔

ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ پنڈت جی کا چھٹا سوال تو بعد میں نقل کروں گا پہلے اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ایسی معلومات میں سے کچھ پیش کر دوں جو مجھے اس واقعہ کے بعد قرآن و حدیث سے حاصل ہوئیں۔ ان کے منجملہ چند نکات پیش کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۳۷ء ۳۸ء میں میں میرانشاہ میں تعینات تھا۔ ایک روز ایرفورس

آفس کی طرف گیا۔ واپسی میں دیکھا کہ گولہ باری کی مشق کے لئے ہوائی جہاز اڑائے جارہے ہیں۔ وہاں کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ واپس آکر عصر کے بعد تلاوت کے لئے کلام اللہ کھولا تو سورۃ والذاریات سامنے تھی۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ	قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد و
فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ	غبار اڑاتی ہیں۔ پھر بوجھ اٹھا
فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ	لینے والی کی۔ پھر آہستہ آہستہ
فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ	چلنے والیوں کی۔ پھر تقسیم کار
(پ ۲۶۔ آخر)	کرنے والیوں کی۔

اب بغیر کسی تاویل کے دیکھیں کہ یہ طیارے کی تصویر ہے یا نہیں۔ میں تو یہ منظر دیکھے ہوئے آیا تھا کہ پہلے تند و تیز ہوا چلتی ہے گرد اڑاتی۔ پھر وہ بوجھ کو اٹھا لیتی ہے۔ پھر بوجھ کو لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ پھر جس مقصد کے لئے یہ کام ہوئے، اسی امر کی تقسیم کار کرتی ہے کہ وہ امر پورا ہوتا ہے۔

سورۃ ملک میں ارشاد ہے:

هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ	اور وہ سب پر غالب اور بخشنے والا ہے
الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ	جس نے تہ بتہ سات آسمان
سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط (پ ۲۹)	خلق کئے۔

پھر ان تہ بتہ آسمانوں کی شرح بھی بیان فرمادی۔ دیکھیں سورۃ مومنون پ ۱۸۔ ع ۱ میں ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ	ہم نے تمہارے اوپر سات
سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا	راستے بنائے اور ہم مخلوق سے
عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝	بے خبر نہیں ہیں۔

سائنس کی تحقیق جدید سے معلوم ہوگیا ہے کہ زمین کے اوپر چھ سیاروں کے مدار ORBIT ہیں اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمین کے اوپر سب سے پہلا راستہ یا مدار چاند کا ہے۔ لہٰذا ہماری زمین کے اوپر ایک راستہ چاند کا ہے اور زمین کے مدار پر چھ سیاروں کے مدار یا راستے ہیں۔ یہ سات راستے تہ بتہہ ہمارے اوپر خالقِ کائنات نے خلق فرمائے ہیں۔ یہ تہ بتہہ سات آسمان ہیں۔ سبحان اللہ

سورۂ نمل کا آخری رکوع دیکھیں۔ ارشادِ ربّ العزت ہے:۔

وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (پ ۲۰ ۔ ع ۳)

تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے ان کو ٹھہرا ہوا حالانکہ وہ چل رہے ہیں چلنا بادل کا۔ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شئے کو مضبوط بنایا۔

مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔

"اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے ان کو جما ہوا مضبوط سمجھتا ہے حالانکہ وہ (قیامت میں) اڑتے ہوں گے اڑنا بادل کا۔ یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شئے کو مضبوط بنایا۔"

اس ترجمہ کی غلطی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ قیامت کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔ قیامت میں تو تباہی ہوگی۔ یہاں خدا کی صنعت کا ذکر ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ سطحِ ارض سے بلندی پر بادل جب حرکت کرتا ہے، وہ سطحِ زمین کی گولائی کے متوازی ہی چلتا ہے اور آیت میں پہاڑوں کے چلنے کو بادل کی چال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت زمین کی اپنے محور کے گرد حرکت کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (پ ۳۰) قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے

اس کو لڑھکایا۔ (سورۃ والشمس)

یہ آیت صاف ہے کہ وہ زمین کی اپنے مدار پر سورج کے گرد حرکت کرنے REVOLUION پر دلالت کرتی ہے۔

اب صرف ایک اور آیت پیش کرتا ہوں۔ سورہ نور کا پانچواں رکوع ملاحظہ کریں۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ (پ ۱۸)

اس کے نور کی مثال (یعنی وہ نور جو اول مخلوق ہے) ایسی ہے جیسے ایک قندیل ہو۔ اس میں چراغ ہو چراغ شیشہ کے فانوس میں ہو، وہ فانوس ایسا ہو جیسا چمکتا ستارہ روشن ہوتا ہے شجر مبارکہ زیتونی سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ قریب ہے کہ تیل اس کا روشن ہو جائے۔ جب کہ آگ اس سے مس نہ ہوئی ہو۔

اس آیہ وافی ہدایہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بجلی کے بلب کی تصویر ہے۔ کسی تاویل کے بغیر صرف لفظی ترجمہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برق کا ذکر ہے۔ مشکوٰۃ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں چراغ رکھا جائے۔ بجلی کا بلب شیڈ میں رکھا جاتا ہے۔ اس میں چراغ (روشن ہونے والا تار) ہوتا ہے اور چراغ شیشہ کے فانوس یعنی بلب میں ہوتا ہے۔ وہ شیشہ کا فانوس یعنی بلب روشن ستارے کی شکل چمکتا ہے۔ بغیر آگ سے مس ہوئے روشن ہو جاتا ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

اب صرف دو احادیث اور پیش کر دوں پھر اصل مقصد کی طرف رجوع کروں گا۔

۱ـــــ جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

خُلِقَتِ الْاَرْضُ عَلٰی رَاْسِ الثَّوْرِ ـــــــــ	زمین بیل کے سینگھوں پر خلق کی گئی ـ ـــــــــ

بیل کے سینگھوں کی شکل دیکھ لیں کہ وہ گول شکل پر ہوتے ہیں جو اوپر نیچے سے چپٹی ہوتی ہے. یہی زمین کی شکل ہے کہ وہ ایک گول گیند ہے جس کے شمالی اور جنوبی سرے چپٹے ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے لوگوں نے یہ مطلب لے لیا کہ کرۂ زمین گائے کے سینگ پر رکھا ہوا ہے حالانکہ حدیث سے مطلب یہ ہے کہ زمین بیل کے سینگوں کی شکل پہ بنائی گئی ہے۔ حدیث میں یہ تو نہیں ہے کہ بیل کے سینگ پر رکھی ہوئی ہے۔

(۲) خُلِقَتِ الْاَرْضُ عَلٰی السَّمَكِ	زمین مچھلی (کی شکل) پر خلق کی گئی ہے۔

اب ذرا زمین کے مدار (محورمدار) پر اس کی تصویر دیکھ لیں کہ آفتاب کی مخالف سمت میں جو زمین کا سایہ پڑتا ہے تو بالکل مچھلی کی شکل نظر آتی ہے۔ زمین کے اس سایہ کو "قاف" کہتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے عوام الناس میں یہ تخیل قائم ہوگیا تھا کہ زمین گائے کے سینگ پر ٹکی ہوئی ہے. گائے مچھلی پر کھڑی ہے. مچھلی پانی پر ہے اور پانی ہوا پر ٹھہرا ہوا ہے. گائے کا ایک سینگ جب تھک جاتا ہے تو دوسرا بدلنا چاہتی ہے۔ اس وقت زلزلہ آجاتا ہے۔

ایک واقعہ اسکول کے زمانہ کا یاد آگیا۔ اس وقت میں دسویں درجہ میں تھا۔ ایک روز سورۂ یٰسین تلاوت کر رہا تھا۔ جب اس آیت پر پہونچا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ	پاک ہے وہ ذات جس نے جوڑے

كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○	پیدا کیے، ان تمام چیزوں میں سے جو زمین سے اگتی ہیں اور خود ان کے نفسوں میں سے اور ان میں جن کو وہ نہیں جانتے۔
(پ۲۳ ۔ ع ۲)	

میرے ایک بزرگ عزیز فقیہ تھے۔ ان کے پاس گیا اور یہ آیت ان کو سنا کر عرض کیا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نباتات میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ اس پر انہوں نے سخت طرح بھڑکا اور فرمایا "تفسیر بالرائے کفر ہے"۔ پھر ایک تفسیر نکال کر دکھلایا کہ جوڑوں سے مراد مختلف اور متقابل قسمیں ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول سرخ، سبز، زرد، گلابی وغیرہ" میں مرعوب ہو گیا، پھر یہ خیال ذہن سے اتر گیا۔ تقریباً تیس سال بعد جب بغور تلاوت کرنے لگا تو اس کی تائید میں دوسری آیت نظر آئی:۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○	اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت پکڑو۔
(سورۂ ذاریات ع ۲۔ پ۲۷)	

علم نباتات (Botany) نے ثابت کر دیا ہے کہ نباتات میں بھی نر و مادہ ہیں، کھجور اور پپیتہ کو تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ بعض درخت نر ہوتے ہیں۔ بعض مادہ۔ بعض پھول نر ہوتے ہیں بعض مادہ۔ بعض پھولوں میں ایک پھول میں ہی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات کلام پاک نے تیرہ سو سال پہلے ہی واضح کر دی تھی۔

اب اصل مقصد کی طرف یعنی پنڈت جی کے سوالات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

چھٹا سوال

چند دن خاموش رہنے کے بعد ایک روز پنڈت جی نے اپنا آخری سوال پیش

کیا۔ کہنے لگے کہ :۔

"مذہب کا مقصد انسان کے قوائے باطنی کو ترقی دینا ہے۔ کسی مذہب کو قبول کرنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ انسان اس پر عمل کر کے قوائے باطنی کا کمال حاصل کر سکے۔ اگر یہی نہ ہو سکا اور مذہب نے اس طرف رہنمائی نہ کی تو وہ دین بے کار اور فضول ہے۔

قانونِ فطرت ہے کہ نفس کے قوائے باطنی کی ترقی یکسوئی توجہ مراقبہ یعنی دھیان لگانے سے ہوتی ہے۔ جب ایک جگہ بیٹھ کر کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرنے کی مشق کرتے ہیں تو روز بروز قوت توجہ بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ جہاں خیال ہٹانے والی کوئی چیز نہ ہو۔ نشست کا طریقہ بھی ایسا ہو کہ کسی عضو کے وزن کو سہارا دینے کی ضرورت نہ ہو اور اس کو کسی خاص حالت میں رکھنے کیطرف توجہ نہ کرنی پڑے ورنہ وہی نفس کے لئے باعثِ مشغلہ ہو کر توجہ میں مخل ہوگا، اور جب یکسوئی ذہنی قائم نہ رہ سکے تو باطنی قوتوں کی ترقی ممکن نہیں۔

سناتن دھرم اور بدھ مت نے تو ایسی بہت سی ریاضتیں اور عبادتیں بتلائی ہیں جن سے گیان حاصل ہو سکے بلکہ ان مذاہب کی تو بنیاد ہی گیان، دھیان اور بھگتی پر ہے۔

جب ہم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز اس کی افضل ترین عبادت ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود

اولاً پرسش نماز بود

اکثر مسلمان دوستوں سے سنا ہے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ:۔

"نماز دین کا ستون ہے اگر وہ قبول ہوئی تو اور اعمال بھی قبول ہوتے ہیں اور اگر وہ رد کر دی گئی تو اور اعمال بھی رد کر دیتے جاتے ہیں"

گویا کہ یہی وہ عبادت ہے جو تمام دیگر اعمال و عبادات کی روح اور ان کی بنیاد ہے۔

اب اگر آزادانہ طور پر ہم نماز پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مختلف حرکات و سکنات کرنے پڑتے ہیں وہ بھی خاموشی سے نہیں بلکہ کچھ پڑھنے کے ساتھ۔ غرضیکہ نماز تو تمام کی تمام اختلاف حرکات اور تبدیلی خیالات پر مشتمل ہے اور جب خیال تبدیل ہوتا رہے تو یکسوئی ذہنی ممکن نہیں۔ پھر جب یکسوئی توجہ نہ ہو تو کمالاتِ نفسانی حاصل نہیں ہو سکتے۔ لہذا نماز سے قوائے باطنی کی ترقی ممکن نہیں۔ پس جو عبادت قوائے باطنی کی ترقی کی طرف بڑھانے والی نہ ہو بے فائدہ ہے۔

جب اسلام کی افضل ترین عبادت کا یہ حال ہو تو مذہب اسلام گیان اور صفائے باطن کی طرف کس طرح راہ دکھلا سکتا ہے۔ پھر جب یہ فائدہ بھی نہ ہو تو ایسے مذہب سے کیا فیض حاصل ہو سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب

بندہ نے کہا۔ کسی چیز پر ظاہری نظر ڈالنے سے اس کے عیب و صواب کا نظر آنا محال ہے لہذا جو لوگ اعمال و عقائدِ اسلام کو سرسری اور ظاہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے

ذہن میں وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حقائق کی طرف توجہ دلانے والا موجود ہو اور وہ جو کچھ بتلائے، اس پر غور و فکر کریں تو البتہ محاسن نظر آ سکتے ہیں۔

دیکھئے جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کسی مذہب کی حقانیت کی پہچان یہ ہے کہ وہ قوائے باطنی کی تکمیل کے طریقے سکھلائے تو ہر وہ دین جو ایسی تعلیم دے دین حق ہے مگر ایسے تمام ادیان میں ہم کیسے معلوم کریں کہ ان میں کونسا دین احق ہے جس کو دوسرے ادیان پر ترجیح دینی چاہیئے۔

بعض ادیان تو ایسے مشکل اور ناقابل عمل طریقے بتلاتے ہیں جن پر ہر شخص عمل نہیں کر سکتا بلکہ صرف چند افراد ہی ان پر عامل ہو سکتے ہیں اور ایک مذہب ایسے سہل و آسان طریقے سکھلاتا ہے جن پر چل کر اکثر افراد کمالاتِ نفسانی حاصل کر سکیں تو وہی دین لائق ترجیح ہوگا۔ جو شخص اس راستہ کو اختیار کرے گا، گھاٹے میں رہے گا۔

دیکھیے ہر صاحبِ فہم جانتا ہے کہ کمالات قوائے باطنی اور صفائے قلب یکسوئی ذہنی اور توجہ الی اللہ سے حاصل ہوتے ہیں تو جو شخص روزانہ کچھ وقت اس پر صرف کرے وہ حصولِ کمالات میں اس شخص کی برابر نہیں ہو سکتا جو تمام دن اسی حالت میں گذار دے۔

یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں، پس جو شخص تمام دن توجہ الی اللہ میں گذارے گا، وہ منزلِ کمال کی طرف تیزی سے بڑھے گا اور حصول کمالات باطن میں ان لوگوں پر سبقت لے گا جو چند گھنٹے روزانہ ریاضت کرتے ہوں۔

اب یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کونسا مذہب ہے جس نے اپنے پیرووں کو ہر وقت ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ میں مصروف رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام ہی وہ دین واحد ہے جس نے اپنے تابعین کو ہر وقت یاد خدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ کلام اللہ میں بہ کثرت آیات ایسی ہیں جن میں حکم ہے۔ اللہ کی یاد[1] بہ کثرت کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ کہیں حکم ہے مجھے اٹھتے بیٹھتے یاد

۱؎ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

کرو[1]۔ نمازِ جمعہ کے لئے حکم ہے۔ "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبار میں مصروف ہو جاؤ) اور اللہ کا ذکر بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔

غرضیکہ اسی طرح کی بہت سی آیات قرآن پاک میں موجود ہیں جن سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے کہ بندہ ہر وقت، ہر دم و ہر لحظہ اور ہر حال میں مالک کا ذکر کرتا رہے اور کسی وقت بھی اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔

ہر اس شخص کے لیے جو کمالاتِ باطنی کا خواستگار ہو عقل تو یہی حکم دے گی کہ ہر وقت مالک کی یاد میں مصروف رہے۔ روز و شب اس کی یاد میں گذارے تاکہ منازلِ کمال کیطرف قدم بڑھا سکے۔

اب ہر شخص یہ کہے گا کہ یہ تو دنیا کے کام کاج چھوڑے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے فقراء، سادھو اور اولیاء اللہ دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو کر ریاضتیں کرتے تھے۔ تب ہی ان کو کمالاتِ باطنی حاصل ہوتے تھے۔ قریب قریب تمام مذاہبِ عالم میں عوام الناس ان ہی لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو تارک الدنیا ہو کر گوشہ نشینی میں ہر وقت مالک کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہ ہی اولیاء اللہ اور محبانِ خدا سمجھے جاتے ہیں۔

تارک الدنیا اشخاص میں کچھ نہ کچھ کمالاتِ نفسانی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اہلِ دنیا کا ان کی طرف رجوع کرنا، ان کو ولی اللہ سمجھنا ناگزیر ہے مگر اسلام نے ترکِ دنیا کی ممانعت کی ہے اور رسولِ اسلامؐ نے فرمایا ہے:۔

---

[1] فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ — اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

پس جو شخص دنیا سے منہ موڑ کر زندگانی دنیا کو چھوڑ کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہے۔ اس نے گویا اسلام سے منہ پھیر لیا۔ اسلام کی رو سے رہبانیت اچھا عمل نہیں ہے۔ مگر عوام الناس اس کو بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔ اگر عقل و فطرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ رہبانیت باوجودیکہ اس سے کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل ہو جاتے ہیں ممدوح نہیں ہے بلکہ مالک کی مرضی کے خلاف ہے۔

جناب کو یہ خیال تو ضرور آئے گا کہ بھلا ایسی کونسی کسوٹی ہوگی جس پر اس عمل کو پرکھا جا سکے اور اس کو غیر ممدوح ثابت کیا جا سکے؟ مگر کمترین عرض کرتا ہے کہ آپ مشوش نہ ہوں۔ ہر عمل کی برائی اور بھلائی تمیز کرنے کا سہل ترین طریقہ آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں۔

دیکھئے اگر کوئی عمل ایک شخص کے لئے اچھا ہے تو دنیا کے ہر مرد و زن کے لئے اس پر عمل کرنا مفید ہی ہوگا اور اگر ایک کام کسی ایک شخص کے لئے بُرا ہے تو ہر شخص کے لئے اس پر عمل کرنا بُرا ہی ہوگا۔ اب رہبانیت کو اسی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں۔ اگر باطنی قوتوں کے کمالات حاصل کرنے کے لئے کاروبارِ دنیا کو ترک کر کے گوشہ تنہائی میں جاگزیں ہو جانا مرضیٔ خالق کے مطابق ہے اور اس سے مالک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے تو ہر شخص پر لازم ہوگا کہ کاروبارِ دنیاوی سے منہ موڑ کر دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر صحرائے لق و دق یا کسی غار میں جا بیٹھے اور تنہائی میں زندگی گذارے۔

اب غور کریں اور سوچیں کہ اگر دنیا کا ہر مرد و زن رہبانیت اختیار کر لے تو کیا دنیا ویران نہ ہو جائے گی اور بہت قلیل مدت میں روئے زمین پر کیا ایک متنفس بھی باقی رہ جائے گا؟

اب تو واضح ہو گیا کہ رہبانیت رضائے خالق کے منافی۔ اس کی مرضی کے خلاف ہے اور

اس پر عمل کر کے کوئی شخص خوشنودیٔ خالق حاصل نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ ایسا شخص کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل کر کے مرجعِ خلائق بن جائے مگر اس سے رضائے الٰہی حاصل ہونا ممکن نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب ہر فردِ بشر پر قوائے باطنی کو ترقی دینا لازم ہے جس کے بغیر خوشنودیٔ خالق حاصل نہیں کر سکتا جس کا واحد ذریعہ توجہ الی اللہ میں وقت گذارنا ہے جو گوشہ نشینی کے بغیر ہو نہیں سکتا اور ترکِ دنیا خالق کی مرضی کے خلاف ثابت ہوا تو آخر انسان وہ کونسا طریقہ اختیار کرے جو مالک کی مرضی کے مطابق بھی ہو اور اس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں۔

اس کے لئے خود اپنے نفس کی فطرت کا مطالعہ لازم ہے۔ اپنے روزمرہ کے مشاہدے پر غور کریں۔ آپ روزانہ دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ جب آپ کارخانہ کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں تو میز پر قلمدان، کتابیں، رجسٹر وغیرہ رکھے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ آپ کی توجہ کا مرکز تو صرف حساب کی رقوم ہوتی ہیں مگر قلم، سیاہی لینے کے لئے ہر مرتبہ دوات ہی میں جاتا ہے حالانکہ آپ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کبھی نہیں کہ آپ کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی کسی چیز سے ٹکرائے۔ ہر چند کہ آپ حساب لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور کچھ نہ کچھ توجہ ماحول کی چیزوں کی طرف بھی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفسِ انسان جس وقت کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اپنے ماحول سے کلیتاً غافل نہیں ہوتا بلکہ توجہ کی خفیف شعاعیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی توجہ ماحول کی ہر شے کی طرف رہتی ہے۔ اور یہ بھی قانونِ فطرت ہے کہ نفسِ انسان کی جس قوت کو بھی ترقی دینے کی مشق کریں گے وہ برابر بڑھتی چلی جائے گی۔

خوشخطی ہی کو دیکھ لیں۔ ابتداء میں کوئی حرف صحیح لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر تدریجی مشق سے یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اگر ایک حرف بیس مرتبہ بھی لکھے تو بالکل ایک

ہی شکل ہو گی - پس جب نفسِ انسان میں تقسیم توجہ کی اہلیت موجود ہے کہ وہ ایک مرکز کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور طرف بھی اجمالی توجہ کر سکتا ہے تو اگر تقسیم توجہ کی مشق کرائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند سال کی تدریجی اور مسلسل مشق سے یہ اہلیت پیدا نہ ہو جائے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مراکز کی طرف توجہ کر سکے۔

جب خالق نے بندوں کو حکم دیا کہ میری یاد ہر وقت کرتے رہو۔ ہر دم و ہر لحظہ میری طرف متوجہ رہو اور میری دنیا کو بھی آباد رکھو۔ پھر یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ممکن تھے۔ مگر وہ فاطرِ فطرت جس نے قوائے ظاہری و باطنی نفس انسان میں ودیعت فرمائے ہیں۔ خود ہی خوب جانتا ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ اس سے کس طرح لئے جائیں۔

اس نے اسی واسطے ایمان لانے والے بندوں پر دن میں پانچ وقت کی نماز لازم قرار دی جس میں کھڑا ہونا۔ رکوع کرنا۔ بیٹھنا۔ سجدہ کرنا۔ سورے اور تسبیحات پڑھنا ان کی قرارت و مطالب کیطرف توجہ کرنا اور مالک طرف بھی توجہ رکھنا، ایک جگہ جمع کر دیا۔ تاکہ مومنین کے نفوس کو اس کی مشق کرائی جائے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو ارکان کی طرف بھی توجہ کریں۔ واجبات کی طرف بھی توجہ کریں، مستحبات کی طرف بھی توجہ کریں۔ قرارت کی طرف بھی توجہ کریں اور ہر حال میں مالک کی طرف بھی توجہ کرتے رہیں۔

پس جو نفس روزانہ پانچ مرتبہ تقسیم توجہ کی ایسی مشق کرتا رہے گا تو کیا چند سال میں اس میں اتنی بھی اہلیت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک وقت میں دو طرف ہی توجہ کر سکے۔ کہ اپنے خالق کی طرف بھی توجہ کرتا رہے اور ساتھ ہی دنیا کے کاموں کی طرف بھی متوجہ رہ سکے۔

پس جب یہ اہلیت پیدا ہو جائے گی تو دنیا کے کاروبار میں مصروف رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو گا اور اس طرح قوائے باطنی کے کمالات کے حصول میں

جلد کامیاب ہوگا۔

اللہ پاک نے اپنے کلام پاک میں مومنین کاملین کی یہی صفت بیان فرمائی ہے کہ ان[1] کو معاملاتِ تجارت، کوئی خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی اور سورہ جمعہ میں بھی حکم ہے کہ جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو اور اللہ کی یاد بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ یعنی کاروبارِ دنیا میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ صرف نماز ہی وہ عمل واحد ہے جس سے انسان قوائے باطنی میں ترقی کر کے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل کر سکتا ہے اور مقصدِ خالق کی تکمیل میں بھی مصروف رہ سکتا ہے۔ یعنی خالق کی دنیا کو آباد رکھتے ہوئے، اس کی مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے ایمانِ حقیقی یعنی گیان (معرفت) بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جس سے رضائے الٰہی حاصل ہو گی اور نعیم اخروی کا حقدار ہو جائے گا۔ نماز کے سوائے کوئی طریقہ عبادت ایسا نہیں ہو سکتا جس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں اور رضائے خالق بھی نصیب ہو۔

اب تو ظاہر ہو گیا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو حصول رضائے خالق کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نماز تمام ادیان کی عبادات سے بہتر ہے۔ اب پنڈت جی کہنے لگے کہ واقعی اگر یہ صحیح طریقہ پر عمل کیا جائے تو نماز صفائے باطن کا بہترین ذریعہ ہے۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

گھر کا بھیدی

اس واقعہ کے (جو بیان ہو چکا) کافی عرصہ بعد ایک مسلمان جنٹلمین سے ملاقات

---

[1] لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ط (سورہ نور ع ۵)

ہوئی جو ایک بڑی کمپنی میں اور سیر تھے۔ جب ان کے ساتھ نشست و برخاست کا سلسلہ ہوا تو معلوم ہوا کہ صاحب موصوف دہریت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر مذہب سے بیزار ہیں۔ ایک روز نماز کے متعلق کہنے لگے کہ "اس اٹھا بیٹھی سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟"

کچھ عرصہ پہلے پنڈت جی سے نماز کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی اس کو اجمالاً بیان کر کے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو تقسیم توجہ کی مشق کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ سن کر ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کہ:

"آپ دین کے معاملہ میں کوئی ذمہ دار حیثیت تو رکھتے نہیں، جو آپ کے قول کو حجت سمجھ لیا جائے۔ اس وقت اسلام میں دو بڑے فرقے ہیں۔ شیعہ اور سنی، ان کی جو ذمہ دار ہستیاں اراکینِ دین سمجھی ہیں۔ وہ علماء دین ہیں۔ ان حضرات میں سے کسی نے بھی یہ انوکھا خیال جو آپ پیش کر رہے ہیں ظاہر نہیں فرمایا۔ لہٰذا یہ آپ کا ذاتی خیال ہے نہ کہ تعلیم اسلام۔ میں نے دونوں فرقوں کی کتبِ فقہ میں نماز کے مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں کہیں توجہ کا ذکر تک نہیں۔ تمام کتب فقہ میں حرکات و سکنات ظاہری کا بیان ہے کہ ہاتھ کیسے رکھیں۔ پیر کیسے رکھیں۔ رکوع میں ہاتھ کہاں اور کیسے رکھیں سجدے میں کہاں اور کیسے رکھیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہیں ذکر نہیں کہ قلب کیسے رکھیں۔ توجہ کیسے کریں۔ پھر بھلا میں آپ کے اس قول کو کیسے مان لوں اس وقت تو میں نماز کے مسائل میں سے کچھ زبانی سنا سکوں گا۔ مگر آپ یقین کیسے کریں گے۔ میرے پاس فقہ کی چند کتابیں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کل یا پرسوں لے آؤں گا اور آپ کو وہ مسائل دکھلا دوں گا۔"

چنانچہ ایک روز وہ چند کتابیں لے کر آگئے اور کہنے لگے:

"دیکھئے پہلے علما شیعہ کے فتاوی دکھلاتا ہوں پھر علماء اہل سنت کے مسائل دکھلاؤں گا۔

یہ ہے رسالہ مفتاح الہدایہ مطبوعہ صادق پریس احاطہ کمال جمال لکھنؤ جو ایک جلیل القدر مجتہد شیعہ کے فتاوے کے مطابق ہے یہ دیکھ لیجئے آخر میں تصدیق بھی ہے اور مہر بھی ثبت ہے۔ صـ۳۲ پر ہے فصل چوتھی قراءت میں۔ ساری فصل دیکھ لیں۔ صرف اسی پر زور دیا گیا ہے کہ حرف کا مخارج سے ادا کرنا لازم ہے۔ اس کا سیکھنا بہت ضروری ہے۔ مفہوم و معانی کے سمجھنے کا کہیں ذکر تک نہیں۔

دوسرا رسالہ یہ ہے "تحفہ و نجات العباد" مطبوعہ مطبع تصویر عالم ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ۔ یہ ایک رسالہ کا ترجمہ ہے جو عراق کے مجتہد اعلم کے فتاوے کا مجموعہ ہے۔ صـ۶۱ دیکھیں چھٹا باب قراءت میں شروع ہوتا ہے۔ اس میں کہیں مطالب و مفاہیم کا ذکر نہیں۔ صـ۶۲ پر ہے۔ اگر سورہ پڑھنے میں کوئی کلمہ رہ جائے اور بعد کو یاد آئے تو صرف وہی کلمہ پڑھ لے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اس میں سمجھنے کا کہیں ذکر نہیں۔
میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص الحمد للہ العلمین پڑھ گیا اور سورہ پڑھنے کے بعد یاد آئے تو "ڈ پ ل" کہہ لے نماز پوری ہو جائے گی۔

اور یہ دیکھیں رسالہ مفتاح الہدایہ صـ۳۷ "مبطلات نماز" چوتھے بات کرنا بغیر قرآن ...... یہ بات کرنا عمداً مبطل نماز ہے۔ سہواً بات کی تو مبطل نماز نہیں۔ پانچویں قہقہہ۔ یہ مبطل نماز ہے عمداً و قہراً۔ اگر نماز سے غافل ہو کر ہنسے تو مبطل نماز نہیں۔ چھٹے رونا واسطے امور دنیا کے......

اور اگر حالتِ غفلت میں نماز سے رو دئے تو ضرر نہیں رکھتا۔

اب علماء اہل سنت کی کتب ملاحظہ فرمائیں۔ یہ ہے "منیۃ المصلی" با ترجمہ فارسی مطبوعہ صابر الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور۔ یہ کتاب علماء متقدمین و متاخرین کے فتاویٰ کی تلخیص ہے۔ تمام کتاب دیکھ جائیں۔ کہیں توجہ کا ذکر نہیں۔ صہ ۲۰۱ پر فصل مَا یُفسِدُ الصَّلٰوۃَ شروع ہوتی ہے۔

صہ ۲۰۱ : اگر کلام کیا لوگوں کی باتوں سے بھول کر یا عمداً فاسد ہوتی ہے نماز مگر شرط یہ ہے کہ اتنی آواز سے ہو کہ اپنے کان میں آواز پڑتی ہو۔

صہ ۲۰۶ : اگر کسی کے ہاتھ میں تیل ہو اور سر کو ملے فاسد نہیں ہوتی (نماز)

صہ ۲۱۱ : اگر کوئی شعر انشا کیا یا خطبہ انشا کیا اور زبان سے کلام نہ کیا نماز فاسد نہیں ہوتی۔

صہ ۲۱۳ : اگر مارے جوئیں چند بار پس اگر ماریں پے در پے نماز فاسد ہوگی۔ اگر مارنے کے درمیان وقفہ ہے تو فاسد نہیں ہوتی۔

صہ ۲۰۸ : اگر عمامہ سر سے اتارے اور زمین پر رکھے یا زمین سے اٹھا کر سر پر رکھے یا قمیص اتارے یا ایک ہاتھ سے عمامہ باندھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

اب یہ کتاب مالا بد منہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ کتاب تو اتنی مشہور ہے کہ ہر مسلمان اس کے نام سے واقف ہے۔ اس میں بھی ایسے ہی مسائل ہیں۔"

غرضیکہ ان کتب سے بہت سے مضحکہ خیز مسائل دکھلاتے رہے جن کو میں تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ مسائل دکھلانے کے بعد کہنے لگے کہ:

"اب بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کے فقہائے کرام و مجتہدین عظام کے فتاویٰ سے جو ارکینِ دین و حامیانِ شرع متین ہیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز میں یکسوئی توجہ کی ضرورت نہیں اور آپ توجہ کا راگ الاپ رہے ہیں۔ پھر جب آپ عالم ہیں نہ فقیہ اور نہ دین میں کوئی ذمہ دار حیثیت رکھتے ہیں تو مستند علمائے کرام کے فتاویٰ کے مقابل آپ کی رائے اور قیاس کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ تمام کتب فقہ دیکھنے سے جملہ مسائل کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :-

۱ — نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کا مفہوم سمجھنا ضروری نہیں ہے۔

۲ — نماز میں یکسوئی توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہاتھ سے کوئی بھی کام کر لیں۔ نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمامہ باندھ لیں، جوئیں مار لیں، شعر انشا کر لیں، خطبہ انشا کر لیں، نماز سے غافل ہو کر ہنس لیں، رو لیں نماز درست ہی رہے گی۔

۳ — بس باقاعدہ اٹھا بیٹھی کرنے سے اللہ پاک راضی اور خوش ہو جاتے ہیں۔

۴ — ایک مولوی صاحب نے وعظ میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ نماز کو فرشتے عرشِ الٰہی پر لے جاتے ہیں اور اللہ پاک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر قبول ہوئی تو عرش پر رکھ لی جاتی ہے ورنہ حکم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کے منہ پہ مار دو، اور وہ نمازی کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ اب بتلائیے کہ ایک صاحب فہم کے لئے یہ باتیں بھلا کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہیں ؟"

الجواب بعون الوھاب

بندہ نے کہا آپ کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ اس لئے کہ تمام اعتراضات کی بنیاد فقہاء کے اقوال پر ہے۔ وہ خدا و رسول کے اقوال نہیں ہیں۔ یہ سن کر قہقہہ لگایا اور بولے:

"یہ تو آپ جان بچا کر خوب بھاگے۔ جب کچھ جواب بن نہ پڑا تو علمائے دین سے ہی منکر ہو گئے۔ یہ بہت اچھی راہِ فرار اختیار کی۔"

میں نے کہا جناب میں علماء و فقہاء کے اقوال کا منکر نہیں ہوں۔ یہ تو میں نے اس لئے کہا ہے کہ آپ کو اپنے اعتراضات کی سبکی کا احساس ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ کلام کو طول نہ ہو مگر جب آپ مصر ہیں تو سنیئے۔

مدارس کے ابتدائی درجوں میں ہزاروں طلبا۔ ہر سال داخل ہوتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرتا ہے؟ ان میں سے کتنے ایسے نکلتے ہیں جو پی۔ ایچ۔ ڈی کرتے ہیں اور تعلیم میں انتہائی منازل تک پہنچتے ہیں؟

ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ جن کے مالی حالات مساعدت کریں گے وہ ہی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر سکے گا مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔ اکثر مالدار رہ جاتے ہیں اور نادار اعلیٰ منازل حاصل کر لیتے ہیں۔

اگر غور کریں ظاہر ہو جائیگا کہ جس میں اہلیت ہوتی ہے وہی کسی علم یا فن میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اسی اصول پر کمالاتِ نفسانی بھی وہ ہی حاصل کر سکتا ہے جس میں فطری اہلیت ہو۔ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ ہر شخص حقیقت کا بار نہیں اٹھا سکتا اور کثرت عوام جہال کی ہوتی ہے۔ مفکرین تو بہت کم ہوتے ہیں لہذا نمازِ حقیقی کا بار ہر شخص پر نہیں ڈالا جا سکتا

خود اللہ تعالے کا فرمان ہے :۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا
(آخر سورہ بقرہ)

اللہ تعالے کسی نفس کو اتنی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی وسعت یا اہلیت سے زیادہ ہو۔

لہذا اگر عوام پر اتنا بار ڈال دیا جائے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکیں تو نماز ہی سے بھاگ جائیں گے مگر ہر حال میں یہ تو ضروری ہے کہ عوام کو ایک تنظیم میں منسلک رکھا جائے اسی لئے فقہائے کرام نے اپنے زمانہ کے عوام کی اہلیت کے مطابق اپنی رائے اور قیاس سے کچھ حدود مقرر کئے ہیں۔ ان پر اعتراضات کی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں۔

اب میں آپ کو قرآن کریم ہی سے دکھلاتا ہوں آپ خود ہی ترجمہ دیکھ لیں کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ آیات قرآنیہ ہی سے آپ کے تمام اعتراضات رد ہو جائیں گے۔ مگر یہ احکام ان ہی لوگوں کے لئے ہیں جو تقرب بارگاہِ ایزدی کے طالب ہوں، تفکر و تدبر کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اب آیات قرآنیہ دیکھیں۔

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ط
(پ ۵ ع ۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک تم نشہ کی (یا غنودگی کی) حالت میں ہو۔ یہاں تک کہ تم یہ جان سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

دیکھئے یہاں نشہ یا غنودگی کے عالم میں نماز پڑھنے کو کیوں منع کیا گیا ہے۔ اس کا سبب بھی واضح کر دیا ہے کہ نشہ کی حالت میں آدمی نہیں سمجھتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لہذا جب تک اتنی صحت ذہنی نہ ہو اور حواس اتنے درست نہ ہوں کہ وہ یہ جان سکے کہ کیا کہہ رہا ہے اس وقت تک نماز کے قریب نہ جائے۔ یہاں یہ تو نہیں کہا گیا کہ نماز کے قریب نہ جاؤ

جب تک تم یہ نہ جان سکو کہ تم کیا پڑھ رہے ہو (حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ نہیں بلکہ تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ ہے یعنی جان سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو)

تمام فقہائے اسلام اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص نے شراب پی۔ اس کے بعد نماز پڑھی تو اگر نشہ نہیں ہے تو نماز اس کی درست ہے۔ اس کا یہ فعل بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے جھوٹ بولا یا کسی کی غیبت کی۔ اس کے بعد نماز پڑھی تو نماز سے قبل جو گناہ اس نے کئے ان کی سزا کا حقدار ہے۔ نماز پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اسی طرح شراب پینا بھی ایک گناہ ہے۔ پینے والے کو اس کی سزا ملے گی۔ پس اگر نشہ نہیں ہے اور نماز پڑھتا ہے تو نماز سے قبل جو گناہ اس نے کیا ہے اس کی نماز میں فساد کا باعث نہ ہوگا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ فقہاء تو نماز میں معانی و مفاہیم کا سمجھنا ضروری نہیں بتلاتے۔ بے شک عوام کے لئے یہ سہولت دینا ضروری ہے۔ مگر جو شخص معارف قلب اور تقرب ایزدی حاصل کرنے کا طالب ہو، اس کے لئے یہ مشکل نہیں۔ ہر مسلمان چند سورے اور تسبیحات التحیات و تشہد وغیرہ نماز کے لئے حفظ کرتا ہے تو کیا ان کے معانی یاد نہیں کر سکتا اگر معنی سمجھ کر حفظ کرے تو بے سمجھے از بر کرنے کی نسبت کم وقت میں حفظ ہو سکیں گے۔ پھر نماز بھی سمجھ کر پڑھے گا۔

۲ نماز میں توجہ بالقلب ضروری ہے یا نہیں؟

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ چیزیں عوام کے لئے نہیں ہیں بلکہ صاحبان فکر کے لئے ہیں۔ جو ان کا بار اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں، دیکھئے ارشاد باری ہے:۔

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَ اَقِیۡمُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ ادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ	کہہ دو میرے رب نے عدل کا حکم دیا ہے اور تم اپنے نفسوں کو قائم کر لو ہر نماز کے وقت اور اس کو پکارو اسی کے لئے دین خالص

(پ ۸ - ع ۱۰ - اعراف ع ۳) کرتے ہوئے۔

اس آیت کا پہلا فقرہ دیکھئے۔ رب نے عدل کا حکم دیا ہے۔ عدل کے معنی ہیں، کسی شے کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا۔ اس آیت کا صرف ایک جزء اَمَرَ رَبِّی بِالْقِسْطِ (میرے رب نے عدل کا حکم دیا ہے) اسلام کا مقصد سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ رب کا حکم یہ ہے کہ ہر شے کو اور اپنی ہر ظاہری و باطنی قوت کو بندہ اس کے صحیح مقصد کے لئے استعمال کرے ورنہ عدل نہ ہوگا بلکہ ظلم ہوگا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ بغیر اصلاحِ نفس عدل کر سکے۔ جب تک انسان کے خواہشات و جذبات عقل فطری سے مغلوب نہ ہو جائیں، اعتدال کلّی پر قائم رہنا ممکن نہیں اور نفس میں یہ کیفیت بغیر توجہ الی اللہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے آپ کہنے لگیں، یہ تو تاویل ہوئی۔ آپ نے اپنی مرضی کے مطابق ایک مطلب استخراج کر لیا۔ اس آیت سے توجہ کہاں ثابت ہوتی ہے۔ تو اب آیت کا دوسرا جزء دیکھیں۔ "ہر نماز کے وقت اپنے نفس کو قائم کر لو" یعنی اپنی توجہ یکسو کر لو۔ ایک مرکز پر قائم کر لو۔ ورنہ اس کے سوائے نفس کو قائم کرنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ ہر چند کہ اس سے اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا مگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی واضح دلیل نہ ہوئی، تو آیت کا تیسرا جزء دیکھ لیں۔ "اس کو پکارو دین خالص کرتے ہوئے اسی کے لئے" اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہاں توجہ بالقلب اور خلوص کامل طلب کیا جا رہا ہے۔

ممکن ہے کہ آپ کہنے لگیں کہ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے کیا معنی ہیں اور آپ نے کس دلیل سے یہ مطلب اخذ کیا تو سورۂ یونس کی یہ آیت دیکھ لیں۔ اس سے صاف واضح ہو جائے گا کہ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ سے مالک کی مراد کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ	وہ وہی (آقا) ہے جو تم کو خشکی اور تری میں سیر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوں اور

بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

پ ۱۱ - ع ۸

موافق ہوا ہیں ان کو لے کر چلیں اور اس سے خوش ہوئے۔ ناگاہ اس پر تیز ہوا کا جھونکا آپڑا اور ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگیں اور گمان کرنے لگے کہ اب بالکل گھر گئے۔ اس وقت پکارتے ہیں اللہ کو دین خالص کرتے ہوئے اس کے لئے۔

یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ سے وہ کیفیتِ نفسی مراد ہے جو کشتی میں سوار ہونے والوں کے نفوس پر طوفان کے وقت طاری ہوتی ہے۔ ان الفاظ کا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ خلوص کامل کی کیفیت ہے کہ اس وقت کوئی اور خیال آہی نہیں سکتا۔ بس مالک کی طرف ہی لو لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی کیفیتِ خلوص نماز میں طلب کی جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ اس امر کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ نماز میں توجہ ضروری ہے مگر یہ ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو طالبین تقرب ایزدی متفکر و مدبر ہوں نہ کہ عوام الناس۔

۳ ——— تیسرا فقرہ آپ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اٹھا بیٹھی سے خوش ہو جاتے ہیں تو اس کا جواب بھی سنیں اور دیکھ لیں کہ آیا وہ خوش ہوتے ہیں کہ نہیں۔ یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نہ مفہوم سمجھتے ہیں نہ توجہ قائم کر سکتے ہیں مگر اتنا تو ہر شخص کو خیال ہوتا ہے کہ مالک کی بندگی کر رہا ہوں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ربی الاعلیٰ، ربی العظیم، رب العالمین۔ اللہ اکبر کہتے ہوئے اس کی کچھ نہ کچھ توجہ تو مالک کی طرف ضرور ہو جاتی ہے۔

ایک نادان جاہل بھی جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ مالک کا حکم بجالاتا ہوں اور تھوڑی دیر کو خواہ وہ چند سیکنڈ ہی ہوں۔ رب کے لئے خلوص پیدا ہوتا ہے۔

اچھا اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ ایک شخص ایسا ہے کہ اس کے دل میں نماز سے قبل یا دوران نماز ذرا دیر کو بھی مالک کے لئے خلوص پیدا نہیں ہوا تو بعد نماز اپنے مطالب دنیوی کے لئے دعا ضرور کرے گا۔ اس وقت خلوص ضرور پیدا ہوگا اور قربانی کے ذکر میں اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا	اللہ تعالےٰ کو نہ تو ان کا گوشت
وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ	پہونچتا ہے نہ ان کا خون۔ لیکن
يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط	اس کو تمہارے دل کا خلوص
(سورہ حج۔ ع ۵)	پہونچتا ہے۔

اب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک جاہل کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ خلوص ضرور پیدا ہوتا ہے اور جتنا بھی خلوص پیدا ہوگا۔ اسی نسبت سے اس کو صفائے قلب حاصل ہوگی۔ بندے کے قلب کی صفائی ہی اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا کہلاتا ہے ورنہ اللہ تعالےٰ کوئی آدمی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ کسی سے خوش اور کسی سے ناخوش ہو جائیں۔

۴ اب یہ بھی دیکھ لیں کہ نماز عرش پر جاتی ہے یا نہیں۔ پس اگر قبول ہوئی تو عرش پر رکھ لی جاتی ہے ورنہ پڑھنے والے کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ	اور جان لو کہ اللہ پاک آدمی کے
بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ	اور اس کے دل کے درمیان حائل
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○	ہوتے ہیں اور یہ کہ تم اسی طرف

لوٹائے جاؤگے۔ (پ ۹۔ ع ۱۷)

اور حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ — مومن کا دل اللہ تعالےٰ کا عرش ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ نے اس حدیث کا ترجمہ اپنے دو شعروں میں کر دیا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

کعبہ بنیاد خلیل آذر است! — دل گذرگاہ جلیل اکبر است!

اب تو واضح ہو گیا کہ جب کوئی بندہ مسلم نماز پڑھتا ہے تو جتنی بھی توجہ خالص ہو سکی جتنا بھی خلوص پیدا ہو سکا۔ اس کا اثر دل پر ہوتا ہے۔ پس اگر دل کی سیاہی کچھ کم ہوئی اور نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوئی تو گویا نماز عرش پر رکھ لی گئی۔ یعنی دل پر اس کا اثر ہوا اور اگر قلب پر اثر نہ ہوا تو نماز پڑھنے والے کے منہ پر مار دی جاتی ہے کہ اس کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمازی اور پرہیزگار ہے۔ نماز کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے صفائے باطن پیدا ہو اور دل میں برائیوں سے بچنے کی طاقت پیدا ہو جائے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ — تحقیق کہ نماز بے شرمی کے کاموں اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

پس نماز کی قبولیت یہی ہے کہ دل میں برے کاموں سے بچنے کی اور نیک عمل بجا لانے کی طاقت اور رغبت پیدا ہو۔ اگر دل پر ایسا اثر نہ ہوا تو نماز قبول نہیں ہوئی۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ اِنْ — نماز دین کا ستون ہے۔ اگر وہ

قُبِلَت قُبِلَ مَا سِوَاهَا وَاِنْ رُدَّت رُدَّ مَا سِوَاهَا

قبول ہوئی تو دیگر اعمال بھی قبول ہوتے ہیں اور اگر وہ رد کر دی گئی تو تمام عمل بھی رد کر دیے جاتے ہیں؛

نماز کی قبولیت یہی ہے کہ اس سے صفائے قلب پیدا ہو۔ پس اگر نماز قبول ہوتی یعنی اس سے صفائے قلب پیدا ہوئی اور امورِ خیر کی طرف رغبت ہوئی تو تمام اعمال پہ اس کا اثر ہونا لازم ہے کہ اس کے اعمال صحیح اور درست ہوں گے اور یہی ان کی قبولیت ہے اور اگر دل پہ یہ اثر نہ ہوا تو نماز قبول نہ ہوئی تو اور تمام عمل بھی درست نہ ہوں گے۔ ان میں بھی خلوص نہ ہوگا اور یہی ان کا رد ہونا یا قبول نہ ہونا ہے۔

یہ تو ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں اتنی اہلیت نہیں کہ وہ نعمتیں حاصل کر سکتے جو نماز سے ملتی ہیں۔ اگر نماز حقیقی صحیح طریقہ سے ادا کی جا سکے تو چند سال میں عالم نور کا مشاہدہ ہو جائے اور ہر طرف جلوۂ محبوب نظر آنے لگے اور کہتا رہے ؎

ہر سمت ہر طرف نظر آنے لگے ہو تم
یہ کیا فسوں گری سی دکھانے لگے ہو تم

فالحمد للہ رب العالمین اللھم اھدنا الصراط المستقیم

اس کے بعد صاحب موصوف نے نماز جماعت، روزہ اور وضو کے متعلق شکوک و وساوس پیش کئے۔ جس کے جوابات عقلی و فطری دلائل سے ان کے سامنے پیش کئے۔ اور ان ہی امور پہ بعض دیگر حضرات سے بھی مختلف مواقع پہ گفتگو ہوتی رہی تھی۔ ان تمام مضامین کو یکجا کر کے آئندہ صفحات میں پیش کرتا ہوں۔ دوران گفتگو حوالجات کتب وغیرہ کی تفصیل بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ اب ناظرین کی سہولت کے لئے حوالجات کتب وغیرہ بھی درج کر دئے ہیں۔

★★★

نماز جماعت

معترض کا ایراد یہ تھا کہ عبادت کا مقصدِ وحید توجہ الی اللہ ہے جو تنہائی میں ہی ہو سکتی ہے۔ جماعت یا اجتماع میں یکسوئی توجہ ممکن نہیں۔ پھر نماز جماعت مدارج روحانی میں ترقی حاصل کرنے کے لئے کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

الجواب بعون الوہاب

اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط تخیل پر قائم ہے۔ نماز جماعت میں مقتدی امام کی قراءت سنتے ہیں اور یہ فطری امر ہے کہ جب کوئی مقرر کسی مجمع میں تقریر کرتا ہے تو سامعین کی توجہ اس کی تقریر کی طرف ہوتی ہے۔ دوران تقریر سامعین کو کوئی خیال نہیں آتا۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔ نماز فرادیٰ میں جب مصلی خود قراءت کرتا ہے تو اکثر خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اور یکسوئی توجہ مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ نفس انسان بغیر عادت اور مشق کے کوئی کام پوری انجام نہیں دے سکتا اور جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (جمعہ)

پس جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی روزی کماؤ) اور اللہ کی یاد بہت زیادہ کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ اپنے بندگانِ خاص مومنین کاملین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورہ نور۔ ع ۲۵) — وہ مرد ہیں کہ نہیں غافل کرتی ان کو تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے۔

پس کاروبارِ دنیا میں، خرید و فروخت میں اور معاملاتِ تجارت میں مصروف رہتے ہوئے اللہ کی یاد کرتے رہنے کا حکم ہے اور یہ معاملات جماعت اور اژدہام ہی میں ہوتے ہیں لہٰذا اجتماع میں خدا کی طرف توجہ کرنے کی مشق کرنا بھی ضروری ہے جس کا بہترین ذریعہ نماز جماعت ہی ہو سکتی ہے۔

اب رہے اس کے بے شمار دیگر فوائد اور اس کے راز۔ وہ تو خدا و رسول ہی جانتے ہیں، ہمیں تو ان کا علم نہیں۔ انسان کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربُّ العزت ہے:۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ — اور نہیں دیا گیا تمہیں علم مگر بہت تھوڑا۔

عقلِ انسان کے مدارج بہت مختلف ہیں۔ ہر شخص غور و فکر کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ پس جتنی جس شخص کو عقل ہوگی اور جہاں تک اس کی فکر کی رسائی ہوگی۔ اسی کے اندازے کے مطابق نتائج اخذ کر سکے گا۔ ایک معمولی عقل والا انسان جو نتائج اخذ کر سکتا ہے پیش کرتا ہوں۔

دیکھئے انسان کی دو زندگیاں ہیں، حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی۔ بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے اس کے خواہشات و جذبات، بھوک و پیاس، سرور و الم یعنی خوشگواری اور ناگواری پر منحصر ہوتے ہیں۔ بتدریج وہ انس و ناموسی سے بھی روشناس ہو جاتا

ہے۔ یہانتک کہ اس میں انانیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں بھی اس دنیا میں تمام چیزوں سے علیحدہ ایک وجود ہوں۔

اس احساس کے ساتھ ہی خواہش بقا ظاہر ہوتی ہے یعنی نفس یہ چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ رہ سکوں۔ لہذا فنا سے خائف ہوتا ہے۔ خواہشات وجذبات کی تسکین سے اس کو سرور ہوتا ہے۔ ان کے قطع ہونے یعنی تسکین نہ ہونے سے اضطراب لاحق ہوتا ہے نفس یہ جانتا ہے کہ اگر میری خواہشات پوری نہ ہوسکیں تو فنا ہو جاؤں گا۔ لہذا تمام اسبابِ تسکین خواہشات اس کو محبوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کو مال و دولت، اسبابِ زینت، عزیز و اقارب، جائداد، مویشی وغیرہ پیارے ہوتے ہیں۔

اس کی محبت کا مرکز تو "انا" ہے۔ وہ تو صرف اپنی "میں" سے محبت کرتا ہے۔ لہذا جن اشیاء یا افراد سے اس کی "میں" یا "انا" کا تعلق ہوتا ہے پیارے ہوتے ہیں۔ مثلاً میری ماں، میرا باپ، میرے اعزہ، میرا کنبہ قبیلہ، میری قوم وغیرہ۔

جو خیالات و عقائد غیر محسوس اشیاء اور غیر محسوس عالم غیر مرئی دنیا عالمِ غیب کے متعلق اپنے بزرگوں اور ماحول سے سنتا ہے۔ وہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ جو رسم و رواج بچپن سے دیکھتا رہتا ہے۔ جو عقائد و رسمِ مذہبی اس کو لاشعوری طور پر ارث میں ملتے ہیں وہ اس کا "میرا مذہب" ہو جاتے ہیں اور بہت محبوب ہوتے ہیں۔ ان پر نہ خود تنقید کر سکتا ہے اور نہ کسی سے سن سکتا ہے۔ اس کو ان عقائد و رسوم کے خلاف سے نفرت ہوتی ہے۔

احساسِ انانیت کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ "میں سب سے بڑا" "میں سب سے اچھا" اور یہ بھی قانونِ فطرت ہے کہ جب نفس کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ جو چیز میرے پاس ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں تو اس کو احساس برتری ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے اعلیٰ وارفع سمجھنے لگتا ہے۔

ہیں سب سے بڑا ہیں سب سے اچھا کا احساس اس کو غیر کی اطاعت سے روکتا ہے مگر جب کسی کے پاس ایسی شے یا قوت دیکھتا ہے جس سے یہ محروم ہے یا دوسرے کے پاس اس سے زیادہ ہے مثلاً جسمانی قوت ، مال و دولت ۔ علم و قدرت و اہلیت وغیرہ تو اس سے مرعوب ہو جاتا ہے اور نفس میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے تو اکثر اوقات اس سے حسد کرنے لگتا ہے ۔

تنہائی سے اس کو وحشت ہوتی ہے تو رفیق کی طلب پیدا ہوتی ہے ۔ اپنے ہم خیال و ہم مشرب کی جستجو کرتا ہے ۔ بچوں کو دیکھیں ساتھ کھیلنے کے لئے دوسرے بچوں کو ملاتے ہیں ۔ مل جل کر کھیلتے ہیں ۔ مگر جب ایک کی "انا" دوسرے سے ٹکراتی ہے تو لڑائی ہو جاتی ہے ۔ لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے ہیں ۔ ابھی لڑائی ہوئی تھی ۔ تھوڑی دیر بعد پھر سب مل جل کر کھیلتے نظر آتے ہیں گویا کہ یہ لڑے ہی نہ تھے ۔ بچے تو جلد بھول جاتے ہیں ۔ ان کے ننھے دل بغض سے پاک ہوتے ہیں ۔ مگر بڑوں کے دلوں میں جو کینہ بیٹھ جاتا ہے وہ نہیں نکل سکتا ۔

جب دو اشخاص میں لڑائی ہوتی ہے تو وہی غالب ہوتا ہے جس کی قوت دفاع زیادہ ہو خواہ جسمانی ، ذہنی یا اجتماعی ۔ حیات انفرادی میں انسان تنہا اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا ۔ اس کو دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے تلاش و طلب رفیق کا جذبہ تو ابتداء ہی سے نفس میں موجود ہوتا ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان متمدن پیدا ہوا ہے ۔

نفسِ انسانی کے فطری احساسات کہ "میں سب سے بڑا" "میں سب سے اچھا" میرا مذہب اور میرے نظریات ہی حق ہیں ، میری قوم قبیلہ سب سے زیادہ شریف اور عزت والے ہیں ۔ ہر چند کہ یہ انفرادی زندگی کے لئے ضروری ہیں ۔ مگر ان احساسات و جذبات کے باعث وہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا

لحاظ نہیں کرتا۔

چونکہ نفسِ انسان مقصدِ زندگی یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی طرح اپنے آپ کو اس قابل بنالوں کہ اپنے ہر خواہش و جذبہ کی تسکین کر سکوں اور میں جو چاہوں وہ ہو جائے اور اس اہلیت کے حصول کا ذریعہ مال و دولت کی بہتات کو جانتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنے اغراض کے حصول میں دوسروں کے اغراض و احساسات کا خیال ہی نہیں آتا۔ وہ اس طرف کبھی توجہ ہی نہیں کرتا کہ اس سے دوسروں کو اذیت یا نقصان تو نہیں پہونچے گا اور یہی بات باعث فساد ہوتی ہے۔ اکثر جنگ و جدل تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔

جب ایک جماعت یا قوم کے یہ جذبات ان کے اغراض و مقاصد و نظریات دوسری جماعت یا قوم کے جذبات و اغراض و نظریات سے ٹکراتے ہیں تو فساد فی الارض کا باعث ہوتے ہیں اور نتیجہ میں جنگیں اور خونریزیاں واقع ہوتی ہیں۔ لڑائی میں صرف جذباتِ بہیمیت کار فرما ہوتے ہیں۔ تمام افراد انسانیت کو فراموش کر کے درندے بن جاتے ہیں۔ قتل عام، غارت گری، لوٹ مار میں، زن و مرد، بوڑھا، بچہ، ضعیف و مریض کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ رحم و کرم کا نام و نشان ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ کلام پاک میں بلقیس ملکہ سبا کا قول نقل کیا ہوا ہے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا	بادشاہ جب کسی بستی میں (فتح)
قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا	کر کے داخل ہوتے ہیں تو اس کو
أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَ	اجاڑ دیتے ہیں اور اس کے معزز
كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ٥	لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ
(پ ۱۹۔ ع ۱۸۔ سورہ نمل ع ۳)	ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

چونکہ حفاظت خود اختیاری اور بقائے حیات اجتماعی کے لئے جنگ ناگزیر ہے لہذا اسلام نے دشمنانِ دین کے دفاع کے لئے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت دی مگر

ظلم وتعدی، وحشت وبربریت کی سخت ممانعت کی اور یہ ظاہر کر دیا کہ جنگ کی اجازت محض فتنہ وفساد مٹانے کے لئے ہے۔ فساد پھیلانے کے لئے نہیں ہے۔ جیسا کہ جناب ربّ العزت کا ارشاد ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

(پ ۱۷ ع ۱۲)

(سورہ حج۔ ع ۶)

ان مسلمانوں کو جن سے وہ (کفار) لڑا کرتے تھے اجازت دی گئی (لڑائی کی) اس سبب سے کہ وہ ستائے گئے۔ بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو البتہ ڈھائے گئے ہوتے نصاریٰ کے گرجے، یہود کے عبادت خانے، مجوس کے عبادت خانے اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے اور اللہ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب ہے۔

نیز دوسرے مقامات پر ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

(پ ۲۔ ع ۸۔ سورہ بقرہ ع ۲۴)

اور اللہ کی راہ میں قتال کرو ان لوگوں سے جو تم سے قتال کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُولُهُ (الخ)

(سورہ توبہ ع ۴)

ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہیں حرام جانتے ان چیزوں کو جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دی ہیں۔ (تا آخر آیت)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

(پ ۹ آخر۔ سورہ انفال ع ۵)

اور ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور (ہر طرف) خدا کا دین ہی ہو جائے۔ پھر اگر یہ (فساد سے) باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے اس کو جو وہ کریں

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے لڑائی کی اجازت حفاظت خود اختیاری اور دفاع کے لئے دی ہے جس کا مقصد فساد پھیلانا نہیں بلکہ فتنہ و فساد کو زمین سے مٹانا مقصود ہے۔

جنگ میں عام دستور ہے کہ غالب گروہ مغلوب کا مال و اسباب لوٹنے اور غارت گری میں مصروف ہو جاتا ہے اور جنگی قیدیوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ اسلام نے جنگ کی اجازت کے ساتھ ان غیر انسانی افعال کی سخت

ممانعت کردی۔ چنانچہ جنگ بدر میں جو کفار قید ہوتے تھے وہ اس امر کے معترف تھے کہ ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ قیدی جن اشخاص کی نگرانی میں تھے وہ اکثر ان کے لئے ایثار کرتے تھے۔

عرب کے قدیم دستور کے مطابق غزوہ بدر میں مسلمان بغیر اذن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت لوٹنے پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب کی آیت نازل فرمائی:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝
(پ۱۰۔ ع ۵۔ انفال ع ۹)

اگر پہلے سے خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا نہ ہوتا تو البتہ اس کے باعث جو تم نے کیا تم کو بہت بڑا عذاب پہونچتا۔

عرب میں مال غنیمت کا لوٹنا اخلاقی فرض اور بڑا ممدوح فعل سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی مرحوم سیرت النبی جلد اول میں رقمطراز ہیں:

"مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بڑا سبب یہی ہوتا تھا۔ اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی۔ تعجب یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو کر بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے رہے۔

ابو داؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس سے کہا، پھر جا کر پوچھو شاید تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔ بار بار لوگ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایسا فرمایا ہوگا۔ بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ: لَا اَجْرَ لَہٗ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین آیا۔ قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت متاعِ دنیوی کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک و وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگ احد میں جب اسی بناپر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (سورہ آل عمران ع ۱۶)

اور تم سے ایسے لوگ ہیں جو دنیا کے خواستگار ہیں اور تم ہی میں ایسے لوگ ہیں جو آخرت کے خواستگار ہیں۔

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کوئی شخص غنیمت کے لئے کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔ ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا۔" (علامہ کا کلام ختم ہوا)

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام نے جنگ کی اجازت ان شرائط کے ساتھ دی ہے کہ وحشت وبربریت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ انسانیت کو نہ بھلائیں۔ کسی عورت، بچے، ضعیف، بیمار یا ملازم سے تعرض نہ کریں۔ ان کو قتل نہ کریں کچھ اذیت نہ پہونچائیں۔ صرف لڑنے والوں سے لڑیں اور فقط اعلائے کلمۃ اللہ اور دفع شر و فساد کے لئے جنگ کریں۔

جب حفاظت، خود اختیاری اور بقائے حیات اجتماعی کے لئے جنگ لازمی اور

ضروری ہے تو اس لئے لازم ہے کہ افراد جماعت میں ضم ہو جائیں اور تشکیل جماعت کے لئے سب سے پہلی چیز باہم موانست ہے جو اکثر ملتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسری چیز جو انس پیدا کرتی ہے وہ وحدت عمل ہے۔ دفاع کے لئے فوجی تنظیم کی ضرورت ہے جس کے لئے اقوام عالم میں سپاہیوں کو فوجی پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ایک آواز پر یکساں حرکت کرنے کے عادی ہو جائیں اور صف بندی کے عادی رہیں۔

جنگ میں اس امر کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ افراد جماعت میں احساس برتری و کمتری نہ ہو۔ وہاں تو امیر و غریب، شریف و رذیل کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیئے۔ ضروری ہے کہ اس وقت تمام افراد کے نفوس میں مساوات و ہمدردی کا احساس کار فرما ہو۔

ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو فوجی تنظیم کے لئے قواعد پریڈ سکھائے جاتے مگر اسلام محض حیات مادی کی تعلیم کے لئے نہیں آیا تھا۔ اس نے تو مادی اور روحانی زندگی کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ہماری دنیا دین بن جائے۔ یہ تو ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم نے دین کو بھی دنیا بنا ڈالا۔

مذکورہ بالا تمام مقاصد کے حصول کے لیے اسلام نے نماز جماعت کا حکم دیا تاکہ مسلمان روزانہ پانچ مرتبہ باہم ملتے رہیں۔ ایک دوسرے سے شناسائی پیدا ہو اور یہ ملاقات موانست کا باعث ہو جائے۔

انس باہمی کا دوسرا ذریعہ وحدت عمل ہے جب سب ایک ساتھ مل کر ایک جیسے حرکات و سکنات کریں گے تو باہم انس پیدا ہو گا۔

جنگ کے لئے صف بندی کا عادی ہونا ضروری ہے۔ نماز جماعت سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ایک آواز پر تمام افراد صف بستہ ہو جانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ نماز جماعت سے بعض اہم اور ضروری امور کی عادت راسخ ہو

جاتی ہے مثلاً :

۱ـــــــــ ایک افسر یا امیر (امام) کی آواز پہ سب یکساں حرکت کرتے ہیں

۲ـــــــــ احساس برتری و کمتری باقی نہیں رہتا۔ کوئی رئیس صف اول میں کھڑے ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ کسی بڑے سے بڑے صاحب ثروت کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا۔ اپنے لئے کوئی ممتاز مقام حاصل کرے۔ مثلاً امام کی داہنی طرف کھڑا ہونا چاہیے۔ وہاں تو سب مساوی ہوتے ہیں۔ برتری و کمتری کا احساس نہیں رہتا۔ عملی مساوات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز (علامہ اقبال)

۳ـــــــــ ظلم و بربریت اور غیر انسانی افعال سے بچانے کا ذریعہ واحد خدا کی یاد ہے۔ اسی لئے جہاد میں بھی یہی حکم ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم کسی فوج سے مڈبھیڑ کرو تو اپنے قدم جمائے رہو۔ اور اللہ کی یاد بہت زیادہ کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(پ۱۰ - ع ۲ - انفال ع ۱۰)

یہ نماز جماعت ہی ہے جس میں صف بستہ ہو کر خدا کی یاد کرنے، تسبیح و تہلیل و تکبیر کرنے کی نفوس میں عادت راسخ ہو جاتی ہے۔

۴ دفاع کے لئے ضروری ہے کہ ایک آواز پر افراد جمع ہو جانے کے عادی ہوں۔ فوج میں بگل کی ایک آواز پہ سب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ نماز جماعت سے یہ بھی فائدہ ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی جمع ہونے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہر مسجد میں روزانہ قرب و جوار کے لوگ ہی جمع ہو سکتے ہیں۔ بڑے اجتماع کے لئے

نمازِ جمعہ کا حکم دیا گیا تاکہ ہفتہ میں ایک دن کئی محلوں کے مسلمان مسجد جامع میں جمع ہوں، اور شناسائی و موانست کا دائرہ وسیع ہوجائے۔ اس کے لیئے فرمان رب العزت ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (سورہ جمعہ)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جس وقت پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو دوڑ پڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

ہر ملک میں دستور ہے کہ سال میں چند دن اس کام کے لئے معین کئے جاتے ہیں کہ افواج جمع ہو کر اپنے بادشاہ یا ملک کے لئے اظہارِ وفاداری کا اور شوکت و قوت کا مظاہرہ کریں، جس سے اغیار مرعوب ہوں۔

اسلام اپنے پیروؤں کے لئے سال میں دو عظیم اجتماع کے دن مقرر کئے ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ، تاکہ کئی میل کے گھیرے میں بسنے والے مسلمان ایک عیدگاہ میں جمع ہوں اور خدائی فوج کے یہ سپاہی ملک الناس کی بارگاہِ عظمت و جلال میں وفاداری کے عہد کی تجدید کے لئے سر بسجود ہو جاتے ہیں اور اس مظاہرہ عظیم سے دشمنوں کے قلوب مرعوب ہوں۔

اسلامی روزہ

اعتراض

"اسلام بھی عجیب مذہب ہے کہ سال میں ایک مہینہ فاقے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جس سے جسم کمزور، صحت خراب ہوتی ہے رعب جیسے ملک

ہیں لوگ بہت قوی تھے۔ اس کو برداشت کر سکتے تھے مگر دغیر منقسم ہندوستان کے باشندے کمزور ہیں۔ وہ اتنی قوت نہیں رکھتے کہ ایک مہینہ فاقے کر سکیں یہاں روزے رکھنا مضرِ صحت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام اسلام تمام دنیا کے لئے واجب العمل نہیں ہیں "

ایک ظاہری مسلمان کی زبان سے ایسے مہمل اور لغو اعتراض سننا کس قدر گراں ہوتا ہے۔ افسوس قوم کا کیا حال ہو گیا۔ اکثر نوجوان افراد قوم دہریت میں غرق ہیں اور ظاہراً مسلمان کہلاتے ہیں۔ تمام فرقہ اسلامیہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں۔ مگر افسوس اس کی خبر نہیں کہ ان کی جڑیں کاٹی جا رہی ہے۔ اس طرف کوئی توجہ نہیں کرتا کہ ان کے خلاف دہریت کا بڑا منظم پروپیگنڈا جا رہا ہے۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور توفیق ہدایت عطا فرمائے۔ آمین (مؤلف)

الجواب بعون الوھاب

بے شک اسلام عجیب مذہب ہی ہے اور ایسا عجیب ہے کہ انسان نما حیوانوں کو انسان اور مخدوم ملائک بنا دیتا ہے۔ فطرت جو ہر شے پر غالب و قاہر ہے اس پر غلبہ عطا کرتا ہے۔ اطمینانِ قلب جیسی عظیم الشان نعمت عطا کرنے کی ضمانت دیتا ہے جو نہ کسی علم و فن سے مل سکتی ہے نہ زر و جواہر سے حتیٰ کہ سلطنت مل جانے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسلام اس نعمت عظمیٰ کا وعدہ کرتا ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ ۱۳۔ ع ۱۰)	وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ لہٰذا اس کے احکام و عقائد کے متعلق کوئی شخص اس وقت تک کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ فطرت نفس انسانی کا مطالعہ نہ کرے۔ نماز جماعت کے بیان میں حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی یا حیاتِ قومی کے متعلق اجمالاً کچھ بیان کر چکا ہوں۔ اب یہاں حیاتِ انفرادی کے متعلق تو مزید بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ حیاتِ اجتماعی یا حیاتِ قومی کے لئے اجمالاً مزید کچھ بیان کرنا ہوگا۔

تشکیل حیاتِ اجتماعی

افراد کی بقا کا انحصار جماعت اور قوم کی بقا پر ہے۔ تشکیل جماعت کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز وحدتِ فکر ہے کہ سب کا مقصود ایک ہو۔ محبوب ایک ہو۔ خواہ وہ ملک ہو یا قوم، نظریہ ہو یا معبود۔ اس کے بعد وحدتِ عمل کی ضرورت ہے۔ ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خواہشات و جذبات انفرادی کو جماعت کے لئے قربان کرے اور جماعت میں فنا ہو جائے۔ اسی وقت فرد کی بقا ہو سکتی ہے۔ مرزا غالب مرحوم فرما گئے ہیں ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فرد کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ جماعت میں فنا ہو جائے۔

جب کسی قوم کے افراد میں ہر شخص اپنے اغراض ومقاصد کو جماعت کے اغراض ومقاصد پر قربان کر دینے کا عادی ہو جائے گا تو اس قوم کو عروج حاصل ہوگا۔ اس کو اجتماعی غلبہ ملے گا۔ مگر جب افراد میں خود غرضی غالب آجاتی ہے تو باہم حسد ومنافرت پھیل جاتی ہے۔ ایک دوسرے پر فوقیت وبرتری حاصل کرنے کی خواہش غالب آجاتی ہے۔ انفرادی فائدہ حاصل کے لئے جماعت کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتے اس وقت شیرازۂ قومی منتشر ہو جاتا ہے۔

اقوام عالم کی تاریخ دیکھ جائیں وہی قوم برسر اقتدار آتی ہے جس کے افراد سخت جان، شدائد اور صعوبتیں جھیلنے والے، موت سے کھیلنے والے، ایثار اور قربانی کا جوش وولولہ رکھتے ہوں۔ جب اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مال ودولت، حکومت وسلطنت مل جاتی ہے تو زمین پر یا گرم پتھروں پر آرام سو جانے والے نرم ریشمی گدوں پر آرام کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لق ودق بیابانوں میں ریگستانوں میں دھوپ لو، آندھی وغیرہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے محلات کے اندر خفیف گرمی وسردی کے اختلاف سے بے چین ہونے لگتے ہیں۔ زمین پر پتھروں پر، گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا لینے والے گدے دار کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح کے راحت وآرام میں پڑ کر عیش پرست وآرام طلب ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت سے اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

کسی قوم کی حیات اجتماعی کی بقا کے لئے اس کے افراد میں سخت جانی جفاکشی بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت اور عادت ہونا ضروری ہے دشمنوں کے دفاع کے لئے جنگ ناگزیر ہے اور لڑائی میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ رسد رسانی کا سلسلہ عارضی طور پر کچھ وقت کے لئے منقطع ہو جاتا ہے اگر بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت نہ ہوگی تو بہت جلد ہتھیار ڈال دیں

گے ۔ منجملہ دیگر بے شمار فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہے جس کے لئے روزے کا حکم دیا گیا ہے ۔

حیات اجتماعی کے علاوہ انفرادی زندگی ہی میں دیکھیں کہ بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت کتنی ضروری ہے ۔

ایک چشم دید واقعہ ہے ۔ بنارس ہندو یونیورسٹی بہت سے میکنیکل اور الیکٹریکل انجینئر بنا کر ملک میں پھیلا رہی تھی ۔ ان کو عملی تربیت کے لئے کچھ عرصہ کسی فرم یا ورکشاپ وغیرہ میں کام کرنا ضروری ہوتا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ایک انجینئر صاحب نے پشاور ایم ۔ ای ۔ ایس میں مختلف وسائل استعمال کر کے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ایک عارضی جگہ حاصل کر لی ۔ شہر سے باہر ایک ٹیوب ویل لگایا جا رہا تھا اس کام کا انچارج ایم ۔ ای ۔ ایس کا ایک کیپٹن تھا ۔ ایک روز وہ بنارسی انجینئر صاحب کو اپنے ہمراہ کام پر لے گیا ۔ دن کے دس بجے کے قریب کیپٹن صاحب نے ان کو دیکھا کہ گھٹنوں پر سر ڈالے زمین پر بیٹھے ہیں ۔ جب اس نے دریافت کیا تمہارا کیا حال ہے ؟ تو کہا ، سر آج میں ناشتہ نہیں کر سکا ۔ اس لئے کچھ کام کرنے کے قابل نہیں ۔ شام کو واپسی پر کیپٹن صاحب نے ان کی شکایت پیش کر دی اور دوسرے روز ہی برطرف کر دیئے گئے ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں پیش آنے والے حالات میں سے قریب قریب ہر حال کے لئے عملی تعلیم دی ہے ۔ فاقے میں پیٹ پر پتھر باندھ کر دکھایا ۔ اس کا ذکر تو ہم سن لیتے ہیں مگر اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا فائدہ کیا ہے ؟ یہ تو عمل ہے جو کر کے دیکھے گا اس کو پتہ چلے گا ۔

معاملہ یہ ہے کہ کئی وقت کے فاقے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل اور پھیپھڑے اب نیچے کو پیٹ کی طرف کھنچے جا رہے ہیں ۔ اس کیفیت سے

ہاتھ پیر ایسے ڈھیلے ہو جاتے ہیں کہ حرکت دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پیٹ پر پتھر یا کپڑے کا گولا کس کر باندھ لینے سے وہ کھچاؤ کی کیفیت باقی نہیں رہتی اور ہاتھ پیر اسی طرح کام دینے لگتے ہیں جیسے سیری کی حالت میں کرتے ہیں۔

یہ فوائد تو کیفیاتِ ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ذرا قوائے باطنی کی طرف بھی توجہ کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حیاتِ انفرادی میں وہی شخص کامیاب رہتا ہے جو صاحبِ عقل و فراست ہو۔ انسان کی تمام زندگی شہوات و جذبات کی بندگی میں گذرتی ہے۔ جوشش جذبات میں عقل کام نہیں کرتی۔ جب دو شخصوں میں لڑائی ہوتی ہے تو جس کے جذبات میں سکون ہوتا ہے تدابیر دفاع سوچ سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مخالف کو اشتعال دلاتا ہے تاکہ جوشِ غضب میں اس کی عقل کام نہ کر سکے اور اس طرح اس کو مغلوب کر لیتا ہے۔ اسی لئے جذبات و خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے اور روزہ اسی کی مشق ہے۔ دیکھ لیں کہ حیاتِ انفرادی کے لئے یہ کتنا ضروری ہے۔

حیاتِ اجتماعی میں بھی وہی جماعت غالب رہتی ہے جس میں تعقل ہو جس جماعت کا قائد زیادہ عاقل ہوگا، وہی کامیاب رہے گی۔ ایک مشکل یہ ہے کہ جماعت میں تعقل نہیں ہوتا۔ جب فرد جماعت میں ضم ہو جاتا ہے تو غور و فکر نہیں کر سکتا۔ جماعت میں تو محض جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔

یورپ میں علمائے نفسیات نے تجربات کر کے مشاہدہ کیا ہے کہ جب پانچ چھ فلاسفروں کے مجمع میں ایک شخص نے تقریر کی ہے تو دورانِ تقریر سامعین اپنی قوتِ فکر سے کام نہیں لے سکے۔

پس جب جماعت کی فطری کیفیت یہ ہو تو لڑائی میں ظلم و تعدی، وحشت و بربریت کے مظاہرے سے کیسے بچ سکتے ہیں اور اسلام نے اس کی سخت

ممانعت کی ہے۔

اسلام کیسی جماعت بنانا چاہتا ہے؟ وہ آیات ذیل سے واضح ہو جاتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا (سورہ فتح آخر)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ کفار پر بڑے سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں ان کو دیکھوگے رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ وہ خواستگاری کرتے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (سورہ حج ع ۶)

وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر قابو دیدیں تو نماز کو قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کا حکم کریں، برے کاموں سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام صالحین کی جماعت چاہتا ہے۔ بندگانِ جذبات اگر زمین پر قابو پاتے ہیں تو ظلم کرتے ہیں اور فساد فی الارض کا باعث ہوتے ہیں۔ جو خود ہی اچھے کام نہ کرے وہ دوسروں کو نیکی کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کو بھلائی کا حکم بھی دے گا تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ خود عملِ خیر نہ کرتے ہوئے دوسروں سے نیک کام کرنے کو کہنا یا خود برائی کرتے ہوئے دوسروں کو منع کرنا بے عقلی ہے۔ اسی کو کلام پاک

میں واضح کیا گیا ہے :-

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ ع ۵)	کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلائے ہوئے ہو حالانکہ تم (خدا کی) کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیا تم عقل نہیں کرتے۔

جب یہ قانونِ فطرت ہے کہ جماعت میں تعقل نہیں ہوتا اور جماعت قائد کے حکم اور اس کے اشاروں پر چلتی ہے تو ضروری ہے کہ قائد میں تعقل اور غور و فکر کرنے کی اہلیت ہو۔ بندۂ جذبات نہ ہو۔ اس کے جذبات عقل پر غالب نہ ہوں اور ہر جماعت کا قائد افرادِ جماعت ہی میں سے بنایا جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جماعت میں ایسے افراد موجود ہوں جو انفرادی حالت میں عقل سے کام لینے والے ہوں۔

عام طور پر لفظِ عقل قوتِ فکر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اکثر غلطیاں بھی کرتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ہر شخص کی عقل یکساں نہیں ہوتی۔ مگر عقلِ حقیقی یا عقلِ فطری ہر شخص کے ساتھ ایک قوتِ نورانی ہے جو ہمیشہ صحیح راستہ کی طرف ہدایت کرتی ہے اس کو ضمیر بھی کہتے ہیں۔ نفسِ انسان اپنی خواہشات و جذبات کی تسکین ہی میں مست رہتا ہے۔ عقل و ضمیر سے مشورہ نہیں لیتا۔ بلکہ ضمیر کی آواز کو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے بہت نقصانات اٹھاتا ہے۔

اسلام تو ایسی جماعت چاہتا ہے۔ جس کے افراد عقل سے کام لینے والے ہوں۔ بندگانِ جذبات نہ ہوں۔ حیاتِ انفرادی، حیاتِ اجتماعی اور حیات بعد الموت میں فلاح حاصل کرنے کا ذریعہ عقل کے حکم سے کام کرنا ہے جو اس وقت تک ممکن نہیں جب ہوائے و ہوس پر غلبہ حاصل نہ ہو۔ اسی لئے جناب رب العزت نے بے سوچے سمجھے

بغیر عقل سے مشورہ کئے ہوئے وہوس کی پیروی کرنے کو شرک قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (سورہ جاثیہ)

(اے رسول! کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنے جذبات کو اپنا اللہ بنایا ہوا ہے۔

اسی طرح کی کتنی آیات کلام پاک میں موجود ہیں۔ جن میں خواہشات و جذبات کی بے سوچے سمجھے پیروی کرنے کو شرک قرار دیا ہے یا شہوات و ہوئے کی پیروی کی مذمت کی گئی ہے۔

پس جب دنیا و آخرت میں حصولِ فلاح کا انحصار عقل پر ہے جو اس وقت تک ہو نہیں سکتا جب تک خواہشات و جذبات پر غلبہ حاصل نہ ہو اور یہ اصولِ فطرت ہے کہ انسان عملی مشق کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ نے پیروی جذبات کی مذمت کر کے اس کو شرک قرار دے کر صرف کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہوئی وہوس پر غلبہ حاصل کرنے کی مشق کے لئے سال میں ایک مہینہ کے روزے لازم قرار دیئے تاکہ ایک مہینہ خواہشات و جذبات کے دبانے کی مشق کریں۔ جو لوگ ایک ماہ ایسا کر سکیں گے وہ باقی گیارہ ماہ میں بھی تھوڑا بہت تو اس پر عمل کرتے رہیں گے۔ ان فوائد کے گنانے کے لئے تو دفتر درکار ہیں۔ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اللہ کے کلمے تو ختم ہو ہی نہیں سکتے۔ بس اب ایک فائدہ اور دیکھ لیں۔

روحانی ترقی، وجودِ باری تعالیٰ کا یقین اور ادراک عالم غیب حاصل کرنے کے لئے قلبی توجہ اور خلوص سے اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ تمام حالات میں خلوص سے توجہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر خلوئے معدہ میں یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔

جو شخص روزے میں ہلکی غذا سحر کو کھائے اور خوب سیر ہو کر نہ کھاتے اور قلبی توجہ

کے ساتھ رب کا ذکر کرتا رہے۔ وہ ہی مالک کی نعمات کا مزہ چکھے گا۔ اس کو ادراک عالم نور اور ایمان بالغیب کی نعمت مل جائے گی۔ مگر ہم تو ایسے بدنصیب ہیں کہ ہم نے روزے کو ایک رسم بنالیا ہے۔ اس خیال سے کہ دن میں کہیں بھوک نہ ستاتے، سحر کو خوب ڈٹ کر ثقیل غذائیں کھاتے ہیں جن سے تمام دن نشہ سا سوار رہتا ہے پھر توجہ اور رب کی یاد کیسے ہو سکے گی۔

اکثر لوگوں کو روزے میں غصہ زیادہ آتا ہے۔ بعض کو کہتے سنا ہے "جانتے نہیں میرا روزہ ہے" گویا کہ روزہ سکون جذبات پیدا کرنے کے بجائے اشتعال جذبات کا ذریعہ ہو گیا۔ خدا ہمارے حال پہ رحم کرے اور اپنے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت فرمائے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

فلسفۂ وضو

بعد حمد و نعت خدمت برادران دینی میں عرض ہے کہ کئی مسلمان ——— دہریوں سے مختلف مواقع پر مسائل دینی پر بات چیت ہوئی۔ ایک حضرت تو ایسے دل جلے تھے کہ انہوں نے مذہب کے خلاف بڑا طول طویل لکچر دے ڈالا۔ ان کی تقریر کا لب لباب حسب ذیل ہے۔

"ان مولوی صاحبان نے بھی کیسے مضحکہ خیز احکام بنا رکھے ہیں۔ وضو ہی کو دیکھئے۔ دن میں پانچ وقت ہاتھ منہ دھونا۔ پیر دھونا لازم کر رکھا ہے بھلا اس عروج صنعت کے زمانہ میں جبکہ آدمی صبح سے شام تک سخت مصروف

رہتا ہے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دن میں پانچ مرتبہ جوتے اتارے۔ موزے
اتارے، وضو کرے تب کہیں نماز پڑھے۔ پھر موزے پہنے، جوتے پہنے اور
اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو۔

پھر یہ بھی کتنی مضحکہ بات ہے کہ پیشاب پاخانہ خارج تو اپنے مخرج
سے ہوں اور دھوئے جائیں منہ ہاتھ۔ کلیاں کی جائیں۔ ناک دھوئی جائے
بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ ان مقامات پر نجاست
کیسے پہونچ جاتی ہے؟

مہذب اقوام عالم کو دیکھئے انہوں نے روشنی علم کو مشعل راہ بنایا،
اور مذہبی ڈھکوسلوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ ترقی کی بام بلند پر پہونچیں۔ ہم
ہیں کہ اسی تاریک غار میں پڑے ہیں جس میں ہزار برس قبل تھے۔ نہ کبھی ترقی
کی فکر کرتے ہیں اور نہ کبھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس غار سے نکل کر
دیکھیں کہ دنیا کس قدر وسیع ہے اور کیا کر رہی ہے۔

اگر مسلمان ان ہی مذہبی ڈھکوسلوں اور خلاف عقل عقیدوں میں
پھنسے رہے تو ذلت و خواری کے تاریک غار سے کبھی نکل نہ سکیں گے۔
دنیا آگے بڑھ رہی ہے، مسلمان پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ قومیں بلندی پر
چڑھ رہی ہیں، یہ پستی میں گر رہے ہیں۔ افسوس ہے ان کی عقلوں پر
یہ تمام مذہبی ڈھکوسلوں اور تنگ نظر مولویوں کی بدولت ہے۔

زمانہ برابر ترقی کر رہا ہے مگر مسلمان ہیں کہ تیرہ سو برس پرانے
قانون وضوابط پر عمل پیرا ہیں۔ اس وقت لوگ اونٹ، گھوڑے
گدھے، خچر، بیل گاڑی پر سفر کرتے تھے۔ اب ریل، ٹرام، موٹر کار
ہوائی جہاز ذریعۂ سفر ہیں۔ اگر کوئی شخص اس زمانہ میں بھی ان ہی

پرانی سواریوں کو استعمال کرے اور جدید ذرائع سفر سے متنفر ہو تو اس کو لوگ کیا کہیں گے۔ مجھے تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو سب جاہلِ مطلق کا خطاب دیں گے مگر افسوس ہے مسلمانوں کی عقلوں پر کہ اس زمانۂ عروج و تہذیب میں بھی اپنی زندگی کا سفر اسی پرانے اونٹ کے پالان پر گذارنا چاہتے ہیں اور جدید طرزِ معاشرت سے نفرت کرتے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو صاحبِ فہم و شعور جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ" کے مصداق بنے ہوئے ذلت و خواری کے تاریک غار میں پڑے ہیں۔"

عرض کیا گیا کہ جناب کا لکچر ختم بھی ہوگا یا جاری ہی رہے گا؟ کہنے لگے:۔

"یہی بہت ہے۔ صاحبانِ فہم کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی معقول جواب ہو تو فرمائیں ورنہ وقت فضول ضائع نہ کریں۔"

بندے نے عرض کی کہ اگر میرے معروضات کو آپ بھی اسی صبر و سکون سے سنیں جیسے میں نے آپ کا وعظ سنا تو البتہ کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ اس پر وہ رضامند ہو گئے تو بندۂ حقیر نے عرض کرنا شروع کیا۔

الجواب بعون الوهاب

ایک شخص ایک طبیب حاذق کے پاس گیا۔ نبض دکھلائی بیماری کا حال بیان کیا طبیب نے غور و خوض کے بعد نسخہ لکھ دیا اور کہا اس کو تین روز گھوٹ چھان کر پئیں، پھر آ کر حال بیان کریں۔ مریض صاحب نسخہ لے کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آ گئے۔ کہنے لگے جناب مجھے تو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ طبیب نے پوچھا، آپ نے نسخہ استعمال کیا۔ بولے جی ہاں۔ حکیم صاحب نے کہا ابھی تو ایک ہی دن ہوا ہے۔ دو روز اور

استعمال کیجئے۔ کہنے لگے پھر اور نسخہ دیجئے۔ حکیم صاحب نے کہا، وہ نسخہ کہاں ہے جو کل دیا تھا۔ کہا کہ وہ تو میں نے کل ہی گھوٹ چھان کر پی لیا تھا۔ اب اور نسخہ دیں تو استعمال کروں۔ حکیم جی مسکرائے اور کہا وہ کاغذ تو گھوٹ چھان کر پینے کا نہ تھا، بلکہ وہ دوائیں جو اس پر لکھی تھیں۔ عطار کی دوکان سے لے کر ان کو گھوٹ چھان کر پیتے تو فائدہ ہوتا۔ وہ کاغذ کا پرزہ کیا فائدہ دے سکتا تھا۔

پس اگر کوئی شخص کسی طبیب حاذق کے نسخہ کو گھوٹ چھان کر پیتا رہے اور شکایت کرتا رہے کہ اس کو بالکل فائدہ نہیں ہوتا۔ تو طبیب کا کیا قصور۔

اسی طرح مسلمان بھی قرآن حکیم کو جو انسان کے امراض روحانی دفع کرنے کا اکسیر نسخہ ہے گھوٹ چھان کر پینا ہی یعنی خوب از بر پڑھ لینا اور حفظ کر لینا ہی کافی سمجھتے ہیں لیکن جو دوائیں دفع امراض کے لئے اس میں لکھی ہوئی ہیں، ان کو استعمال کرنا ضروری نہیں جانتے۔ پھر اس کو رٹ لینے اور بار بار اس کا ورد کر لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ کیا کسی طبیب کا نسخہ اور ترکیب استعمال جو اس پر لکھی ہوئی ہے، پڑھتے رہنے سے کسی مریض کو افاقہ ہونا ممکن ہے۔

ہماری مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی آدمی سر پر چراغ رکھے پھر رہا ہو۔ دوسرے لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوں مگر خود اس کو چراغ نظر نہیں آتا۔ اگر کہیں ریت کا کوئی ذرہ چمکتا نظر آتا ہے جس پر اسی چراغ کی روشنی پڑ رہی ہے جو اس کے سر پہ ہے تو اس کی طرف دوڑتا ہے۔ ایسی حالت میں چراغ کو بیکار سمجھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

جب مسلمان قرآن پر عمل ہی نہ کریں۔ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی نہ کریں تو اس میں اسلام اور قرآن کا کیا قصور؟ کیا قرآن نے تفکر و تعقل و تدبر کا حکم نہیں دیا؟ قرآن حکیم میں کتنی ہی آیات ہیں افلا تعقلون (کیا تم

عقل سے کام نہیں لیتے، اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ (کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے) جناب باری تعالیٰ عزاسمہ کا ارشاد ہے:-

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات پ ۲۶)

اور زمین میں نشانیاں ہیں صاحبانِ یقین کے لئے اور خود تمہارے نفسوں میں۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ (آخر حم سجدہ)

ہم اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں گے کائنات میں اور خود ان کے نفسوں میں۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ (پ ۳۰)

کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اونٹ کیسے خلق کیا گیا اور آسمان کیسے بلند کیا گیا اور پہاڑ کیسے نصب کئے گئے اور زمین کیسے بچھائی گئی۔ (سورہ غاشیہ)

اور حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:-

تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللّٰهِ

اللہ کی خلقت میں غور و فکر کرو

یہاں تک فرمادیا:-

تَفَکُّرُ سَاعَةٍ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ

ایک گھنٹہ غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے افضل ہے

ہم تو تاریکی ہی میں پڑے رہے۔ ہم نے اس نور سے کیا فیض حاصل کیا؟ اہل مغرب نے اس نور کی روشنی سے فائدہ اٹھایا۔ کائنات میں غور و فکر کیا۔

فطرت کے راز ان پر منکشف ہونے لگے۔ انہوں نے فطرت کی طاقتوں سے کام لیا۔ زمین سمندر اور ہوا پر ان کو تسلط حاصل ہوگیا۔ اس وقت تمام مشرقی دنیا دول مغرب کی مادی طاقتوں سے مرعوب ہوگئی ہے جس کے باعث ان کے عیوب بھی ہنر نظر آتے ہیں۔ نفس انسان کو اس کی جدت پسندی کے سبب اور مرعوب ہوجانے سے تمدن مغرب مرغوب ہوگیا ہے۔ اس لئے ولائل فاسدہ سے اس کی تائید کی جاتی ہے۔

اس وقت سے ہزار ہا سال قبل کے حالات معلوم کریں تو یہی پتہ چلے گا۔ اس وقت بھی انسان کے دو ہاتھ، دو پیر، دو آنکھیں، ایک ناک، دو کان اور ایک سر تھا۔ اور اب بھی وہی ہیں۔ زمانہ بدلنے سے ضروریات و تکلفات بڑھ گئے مگر جسم انسان میں تو کسی جدید عضو کا اضافہ نہ ہوا۔ نہ کسی عضو نے ترقی کر کے صورت بدلی۔ کیا زمانہ بدلنے اور علوم جدیدہ کے رائج ہونے سے نفس انسان میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ کیا نفس کے خواہشات و جذبات و احساسات میں کوئی تغیر ہوا ہے۔ جب نفس میں اور جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو جو قوانینِ فطرت ہزار ہا سال قبل مفید تھے وہی اب بھی مفید ہوں گے۔ اگر کسی خلافِ فطرت عمل سے ظاہراً کوئی فائدہ نظر بھی آئے تو عارضی ہی ہوگا۔ آخر انجام اس کا ہلاکت و تباہی ہی ہوگا۔

یہ تو فرمائیے کہ آپ اپنی دقیانوسی شکل و صورت کیوں نہیں بدلتے۔ اپنے نفس میں بھی ترمیم کیوں نہیں کرتے۔ جب جسم و نفس ہزار ہا سال پرانے دقیانوسی ہیں تو قوانین پرانے دقیانوسی کیوں مفید نہ ہوں گے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت کبھی بدلتی نہیں۔ ابتدائے عالم سے اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ رب العزت ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ تمہارے لئے دین کی وہ راہ مقرر

مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَ عِیْسٰٓى	کی ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کیا اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا۔ ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو

یہی قدیمی دین ہے۔ اس کے قوانین کبھی نہیں بدلے۔ جب فطرت نہیں بدلتی تو قوانین بھی نہیں بدل سکتے۔ البتہ نظام ظاہری کی صورت ضرورت زمانہ کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ اصل قانون میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ضرورت ہی پیش آئی۔

ان ہی قوانین کے منجملہ ایک وضو بھی ہے۔ اس کے کچھ فوائد و اغراض و مقاصد جو اس حقیر کے ذہن ناقص میں ہیں سن لیجئے۔ اگر عین مطابق عقل و فطرت ہوں تو پھر تسلیم کر لیں کہ اسلام کی مثل کوئی دوسرا راستہ مادی اور روحانی ترقی کا نہیں مل سکتا۔

سنیئے، تندرستی کے لئے آلات ہضم کا درست رہنا نہایت ضروری ہے ان میں سب سے پہلا آلہ منہ ہے جس میں دانت، زبان، تالو، مسوڑے سب شامل ہیں۔ دانتوں کا کام تو واضح ہے۔ دانت اگر غذا کو اچھی طرح نہ پیسیں گے اور وہ خوب چبائی نہ جائے گی، اچھی طرح ہضم نہیں ہو سکتی۔ لہذا دانتوں کی صفائی اور حفاظت صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جس کے لئے شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کا حکم دیا ہے۔

نیز حکم ہے چھوٹا لقمہ لو اور اس کو خوب چبا کر نگلو۔

جبڑوں کے نیچے کچھ غدود ہیں جن سے کھانا کھاتے وقت لعاب آتا ہے جو زبان اور تالو کے مسامات سے نکلتا ہے اور غذا کے ساتھ شامل ہو کر اس کو لائق ہضم بناتا ہے۔ بغیر اس کے ہضم تام نہیں ہو سکتا۔

نیز جب قبض ہو جاتا ہے تو زبان پر کانٹے پڑ جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر خشکی آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان اور ہونٹوں کا معدہ سے خاص تعلق ہے۔ زبان

کو رگڑ کر صاف کرنا معدہ کو قوت پہونچاتا ہے۔ اب تو واضح ہو گیا کہ وضو میں کلی کرنا، منہ کو صاف کرنا کس قدر مفید ہے۔

اب دیگر اعضائے وضو کا آلاتِ ہضم سے تعلق ملاحظہ فرمائیں۔ جب آنتوں میں خشکی ہو جاتی ہے اور سخت قبض ہو جاتا ہے تو ناک میں گرمی، آنکھوں میں جلن سی چہرہ کی جلد پر سوزش، ہاتھوں اور کلائیوں کے مسامات میں خفیف حدت محسوس ہوتی ہے۔ چہرہ تمتماجاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آلاتِ ہضم سے ان مسامات کا خاص تعلق ہے۔

اسی طرح رات کو نہ سونے سے بھی ایسی ہی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے۔ اب غور کر لیں کہ پیشاب پاخانہ یا ریح کے خارج ہونے یا سو جانے سے ان مسامات پہ کوئی خاص اثر ضرور پڑتا ہے۔ ان ہی امور کے واقع ہونے سے وضو ساقط ہو جاتا ہے۔

یہ تو وہ امور ہیں جو مجھ جیسے جاہل کے خیال میں صحتِ جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب کچھ صحتِ روحانی کے متعلق بھی سنئے۔

یہ حقیقت اب روشنی میں آچکی ہے کہ نفسِ انسان سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں جو ماحول پہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق ہپناٹزم کے عامل کو دیکھئے۔ اس کو بھی آنکھوں سے، چہرہ اور ہاتھوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ معمول کی طرف منہ کر کے اس کو بغور دیکھتا رہتا ہے۔ ہاتھوں سے اشارے کرتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعضائے وضو ہی سے مؤثر شعاعیں نکلتی ہیں۔

جو لوگ علوی عمل سے کسی موکل کو مسخر کر لیتے ہیں۔ ان کو ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے۔ اسقاطِ وضو کے بعد موکل پہ قابو نہیں رہتا ہے۔ عامل کی قوت ارادی کی شعاعیں موکل پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

اب حیاتِ اجتماعی میں وضو کے فوائد دیکھیں۔ دنیا میدانِ جنگ ہے یہاں انسان

دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وقت کی قدر کرے۔ چستی اور پھرتی پیدا کرے۔ جس وقت بھی کسی دشمن کے حملے کا اندیشہ ہو فوراً دفاع کے لئے تیار ہو جائے گروہ کا مقابلہ گروہ ہی کر سکتا ہے اور نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ یہ کوئی کام بغیر عادت مشکل سے ہی کرتا ہے۔ یا کر ہی نہیں سکتا۔

لہذا اپنی جماعت کی حفاظت کے لئے خطرہ کے وقت ایک آواز پر تیار ہو جانے کی عادت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ بگل کی آواز پر فوج موزے، جوتے، وردی پہن کر تیار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ مشق ہونی چاہیے کہ اذان کی آواز سنتے ہی چند منٹ کے اندر اندر موزے اتاریں، جوتے اتاریں اور جماعت کے لئے تیار ہو جائیں۔

پس اگر یہ خوبیاں کسی کو نظر نہ آئیں اور مسلمان ان سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اسلام اور شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں کیا قصور ہے۔

مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے حال پر سخت افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ایسے عظیم الشان اور کثیر الفوائد فطری دین کو اپنی بے عملی سے بے سود بنا رکھا ہے۔ دنیا قوانینِ اسلام پر عمل کر کے مستفید ہو رہی ہے اور مسلمان فروعی مسائل پر ہی جھگڑ رہے ہیں اور فرقہ بندی کی بلا میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالے اپنے رحم و کرم سے ہمیں توفیقِ عمل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

عبادت

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝
(پ ۲۷۔ ع ۲۔ الذاریات۔ ع ۳)

اور نہیں پیدا کیا ہم نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ سب ہماری عبادت کریں۔

اس آیہ وافی ہدایہ پر شک کرنے والوں کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خالق نے تمام جن و انس کو اپنی عبادت کے لئے خلق کیا اور ظاہر ہے کہ بہ کثرت افراد عبادتِ خالق نہیں کرتے تو مقصدِ خلقت پورا نہیں ہوتا اور اہلِ عالم کے عبادت سے روگرداں ہونے کا ثبوت خود قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ج اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِىْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝

اے بنی آدم کیا ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھی راہ ہے اور البتہ تم میں سے بہت سوں کو اس نے گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔
(سورہ یٰسٓ۔ ع ۴)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہ کثرت انسان بندگیٔ شیطان میں مصروف رہتے

ہیں اور مالک کی بندگی نہیں کرتے حالانکہ خالق نے ان کو اپنی بندگی کے لئے بنایا تھا۔ اس سے صنعت کا نقص ظاہر ہوتا ہے ورنہ اگر صنعت کا نقص نہ ہو تو ممکن نہیں جو چیز جس کام کے لئے بنائی جائے اس سے وہ مقصد حاصل نہ ہو۔

بعض مفکرین کی طرف سے اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں، اس میں الف لام موجود ہے اور یہ تخصیصی ہے نہ کہ جنسی یعنی اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "نہیں پیدا کیا ہم نے کچھ خاص جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ ہماری عبادت کریں"۔ اگر آیت کا یہی مفہوم ہو تو اس پر یہ ایراد ہوتا ہے کہ جب کچھ افراد کو عبادت کے لئے پیدا کیا تو کیا باقی نافرمانی کے لئے خلق کئے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو باقی تمام جن وانس اگر عبادت سے روگردانی کریں تو مقصدِ خالق کو پورا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو تو عبادت کرنی ہی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ وہ تو اس کام کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔

اس تمام بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ محض تاویل فاسد ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یَعْبُدُوْنَ سے مراد یَعْرِفُوْنَ ہے یعنی "ہم نے جن وانس کو اس لئے بنایا ہے کہ ہمیں پہچانیں"۔ تو کوئی شخص ایسا نہیں کہ اللہ کے وجود کا انکار کر سکے۔ مگر یہ بھی قیاسی تاویل ہے۔ دہریہ اور نیچری دنیا میں بکثرت موجود ہیں جو وجودِ خالق کے منکر ہیں۔ یَعْرِفُوْنَ سے بھی مطلب حل نہ ہوا۔

ان تاویلات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رائے اور قیاس پر مبنی ہیں۔ آیہ وافی ہدایہ سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن تو یہی کہہ رہا ہے کہ "ہم نے تمام جن وانس کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ سب کے سب ہماری عبادت کریں"۔

لوگوں کی عادت ہے کہ قرآن میں تدبر و تفکر کر کے اس کا اصل مفہوم تو سمجھنے کی کوشش کرتے نہیں۔ جو مفہوم خود ان کے ذہن نشین ہوتا ہے اس پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور وساوس پیدا ہوتے ہیں تو قیاس آرائی شروع کر دیتے ہیں اور

اپنے نفس کو تسکین دینے کے لئے تاویلات و تصویلات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بگر قرآن رائے اور قیاس سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک تدبر و تفکر نہ کریں اور عقل و فطرت کی طرف توجہ نہ کریں۔ قرآن کا مفہوم سمجھنا قریب قریب ناممکن ہے۔

وساوس کا مفصّل جواب

نفسِ انسان کی عادت ہے جو الفاظ سنتا رہتا ہے۔ ان کا کچھ نہ کچھ مفہوم ذہن میں قائم کر لیتا ہے اور جب کسی لفظ کا مفہوم ذہن میں قائم ہو گیا پھر کبھی اس کے حقیقی معنی کی تلاش و جستجو نہیں کرتا اس لئے کہ جب بھی کسی کو وہ لفظ بولتے سنتا ہے تو اس کا خیال اُسی مفہوم کی طرف جاتا ہے جو پہلے سے ذہن میں موجود ہے۔

اب غور فرمائیں کہ لفظ "عبادت" سننے سے ہمارا ذہن کس طرف منتقل ہوتا ہے اور بچپن سے اس وقت تک اس کا مفہوم سمجھنے میں ہم نے کس قدر تدریجی ترقی کی ہے۔

اول اول جب کسی سے سنا خدا کی عبادت واجب ہے تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا جب یہ کہتے سنا کہ ہم سے کیا عبادت ہو سکتی ہے۔ خدا کی عبادت تو اولیاء اللہ کیا کرتے تھے۔ دن کو روزہ رکھتے، رات بھر نماز و دعا و تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ اب نفس نے جانا، نماز و روزہ اور ورد و وظائف وغیرہ کو عبادت کہتے ہیں۔ جب کچھ اور شعور ہوا تو جانا کہ حج و زکوٰۃ، ذکر اللہ اور اس کی یاد میں تکالیف اٹھانا بھی عبادت ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سنا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا مفہوم حقیقی سمجھنا کس طرح ممکن تھا۔

الفاظ کا غلط یا ناقص مفہوم ہی شکوک و وساوس کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا ناواقف لوگوں کو غلط فہمی سے نکالنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ لفظ "عبادت" کی ایسی تشریح کر دی جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ سکے۔

عبادت

اگر عبادت کے معنے بس نماز پڑھنا، رکوع کرنا، سجدہ کرنا، روزہ رکھنا ہی ہوں تو لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (شیطان کی عبادت نہ کرنا) سے کیا مراد ہو سکتی ہے کیا کوئی شیطان کے لئے نمازیں پڑھتا ہے؟ کیا کوئی شیطان کو سجدہ کرتا ہے؟ نہیں، اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ عبادت کا حقیقی مفہوم نہیں ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے مفہومِ حقیقی کی جستجو کریں۔

"عبادت" کے لغوی معنی "بندگی کرنا" ہے مگر اس سے تو ہمیں کچھ علم حاصل نہ ہوا یوں سمجھ لیں کہ عبادت کے معنی ہیں عبد کے فرائض ادا کرنا۔ اس سے بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اچھا پہلے یہ معلوم کریں کہ عبد کس کو کہتے ہیں غلام کو۔ مگر اب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ "غلام" کس کو کہتے ہیں وہ شخص جو آزاد نہ ہو۔ مگر یہ تو تمام کے تمام الفاظ ہی ہیں مفہوم کا پتہ نہیں چلتا۔ اچھا یوں سمجھیں کہ "غلام" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کا خود مالک و مختار نہ ہو بلکہ کسی غیر کو اس کی ذات پر حق تصرف مالکانہ حاصل ہو۔

پس واضح ہو گیا کہ "عبد" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی ذات پر اختیار کلی نہ رکھتا ہو، بلکہ کوئی اور شخص اس کا مالک ہو جس کو اس کی ذات پر مالکانہ تصرف کا حق اور اختیار ہو۔

غرضیکہ عبد مملوک کو کہتے ہیں تو پھر "معبود" کس کو کہیں گے۔ یہ امر تو اب واضح ہو گیا کہ کسی عبد کا معبود اس ذات کو کہیں گے جس کو اس عبد پر تصرف مالکانہ کا حق اور اختیار حاصل ہو مگر چونکہ اصطلاحِ شرعی میں لفظ "معبود" "مالک حقیقی" کے لئے مخصوص کر لیا گیا ہے لہذا کسی غلام کے آقا کو، کسی مملوک کے مالک کو اس کا

معبود نہیں کہتے۔ حالانکہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہر آقا اپنے عبد کا معبود ہوتا ہے۔

عبد و معبود کے معنی واضح ہو جانے کے بعد "عبادت" کا مفہوم حقیقی سمجھنا بھی دشوار نہیں رہتا۔ اس کے لئے صرف اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غلام کا کام کیا ہے۔ عبد کے فرائض کیا ہیں اور غلامی عبدیت یا بندگی میں کیا کیا کام داخل ہیں۔ اس کے تمثیلات ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

تمثیل ۱

ایک مرد مفلس وضعیف تن تنہا زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کو اپنی تمام ضروریات زندگی خود ہی مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ بازار سے سودا خرید کر لانا۔ کھانا پکانا۔ رہائشی مکان کی صفائی کرنا۔ کنوئے یا دریا یا نل سے پانی لانا۔ اسباب و ظروف اور جملہ سامان خانہ داری کی صفائی اور اس کو ترتیب سے رکھنا۔ بستر بچھانا تہ کرنا غرضیکہ وہ تمام کام جو زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہیں، اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔

اب فرض کیجیے کسی کریم النفس صاحب ثروت کی نظر ترحم اس ضعیف بے کس پر پڑ گئی اور دریائے کرم جوش میں آگیا اور اس کو ایک غلام ہبہ کر دیا۔ اب یہ ناتواں بوڑھا اس غلام کا آقا ہو گیا۔

اب غور فرمائیں کہ اس غلام کی بندگی میں کیا کیا کام داخل ہوں گے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ تمام کام جو آقا اپنی ذات کے لئے خود بہ نفس نفیس انجام دیتا تھا۔ اب اس غلام کو آقا کے لئے کرنے چاہییں۔ یہی اس غلام کی عبادت ہو گی۔ اب عبادت کا مفہوم کچھ سمجھ میں آیا یعنی "عبادت" کے معنے یہ ہوتے کہ آقا کے کرنے کے کام آقا کی نیابت میں اس کے لئے بندہ انجام دے۔ یہی ہر عبد کی عبادت ہے۔ آئندہ تمثیل سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

تمثیل ۲

ایک ملک التجار نے ایک غیر آباد جزیرہ کسی حکومت سے خریدا جس کا رقبہ تقریباً ۹۰ یا ۹۸ ہزار ایکڑ ہے۔ اگر اس کو آباد کیا جائے تو ضروری ہے کہ تقریباً ہزار بارہ ہزار ایکڑ اراضی مرکزی آبادی کے لئے رکھی جائے۔ جس میں مالک کے رہائشی مکانات، پارک، سیر گاہیں مویشی خانے۔ چراگاہیں، دفاتر وغیرہ، اہل عملہ کیلئے کوٹھیاں وغیرہ، ملازم پیشہ۔ اہل حرفہ اور مزدور پیشہ لوگوں کے رہائشی مکانات ان کے مویشی خانے، درسگاہیں، تربیت گاہیں، صنعتی کارگاہیں، دوکانیں اور بازار وغیرہ ہوں۔ باقی اراضی کو حسب موقع تخمیناً دو دو سو یا پونے دو دو سو ایکڑ کے قطعات پر تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے مواضعات آباد کئے جائیں۔ اتنی بڑی ریاست کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر کام کا شعبہ علیحدہ ہو۔ تمثیلاً چند حسب ذیل ہیں

۱۔ محکمہ انجنیئرنگ، جس کی زیر نگرانی تعمیرات سڑکیں، بار برداری کی گاڑیاں، مشینیں، موٹر کاریں، لاریاں وغیرہ رکھی جائیں۔

۲۔ محکمہ بندوبست و پیمائش اراضی وغیرہ۔

۳۔ محکمہ حساب کتاب و دفاتر وغیرہ۔

۴۔ محکمہ حفظان صحت۔

۵۔ محکمہ تعلیم۔

۶۔ محکمہ صنعت و حرفت۔

۷۔ محکمہ امن عامہ پولیس وغیرہ۔

۸۔ محکمہ زراعت و آبپاشی وغیرہ۔

۹۔ محکمہ امور خارجہ و خرید و فروخت از بیرونجات۔

۱۰۔ محکمہ انتظام و نگرانی تحصیل وصول پیداوار وغیرہ و دیگر امثال۔

اس قدر وسیع تعلقہ کو آباد کرنے کے لئے کتنی ہزار آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ جبکہ
میں ہر ایک مالک کا مطیع و فرمانبردار ہو۔ اس قدر جماعتِ کثیر اسی صورت میں مہیا ہو سکتی
ہے کہ زر خرید غلام ہوں۔ باقی ایسے حاجت مند ہوں جو معاہدے پر دستخط کر کے عارضی
یا دائمی خط غلامی لکھ دیں۔ جتنے غلام دستیاب ہوتے رہیں۔ اسی نسبت سے دیہات آباد کرتے
جائیں۔ ہر قطعہ یا موضع میں تقریباً ایک ثلث اراضی کا ایک ثلث اراضی کاشتکاروں کے
رہائشی مکانات، مویشی خانوں، چراگاہوں۔ شاگرد پیشہ جماعتوں کے مکانات کے لئے
رہے۔ اسی میں منتظمین کے لئے بھی مکانات و قیام گاہیں وغیرہ ہوں۔ باقی اراضی ساٹھ ساٹھ
ستر ستر بیگھے کے کھیتوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اب تقسیم کار و انتظام کاشت کی دو صورتیں
ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تین تین چار چار دفعہ غلاموں کے علیحدہ علیحدہ گروہ بنا
دیے جائیں۔ کچھ دودھ دینے والے جانور، ایک دو جوڑ بیل، ایک دو ہل اور ضروری آلات
کاشت ان کو مستقلاً دے دیے جائیں۔ اور ساٹھ ساٹھ ستر ستر بیگھے آراضی ہر گروہ
کو کاشت کے لئے دے دی جائے۔ اس صورت میں ہر موضع میں تمام کام کی نگرانی
دو تین آدمی بخوبی کر سکتے ہیں۔

جب آراضی، مویشی، آلات کاشت وغیرہ اس طرح تقسیم کر دیے گئے تو ہر گروہ
کو دوسرے کے مقابلہ کا خیال پیدا ہوگا۔ ایک گروہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش
کرے گا۔ جو محنتی نہ ہوں گے۔ ان کو رشک و حسد پیدا ہوگا۔ وہ اپنا کام بہتر دکھلانے کی غرض
سے دوسروں کا کام خراب کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا سیاست و تدبر کی ضرورت
ہوگی۔

اگر مالک یہ اعلان کر دے کہ سال کے آخر میں سب کے کام کا جائزہ لیا جائے گا۔
جس کا کام اچھا ہوگا، انعام پائے گا اور جس کا خراب ہوگا اس کو سزا دی جائے گی۔ پس

سست و کاہل سزا کے خوف سے اور جفاکش انعام کے لالچ میں خوب کام کریں گے مگر ان ہر دو گروہ میں کیا کوئی مالک کے دل میں اپنی وقعت پیدا کر سکتا ہے۔ نہیں، ایسے غلام مالک کی خوشنودی اور تقرب حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض ان میں ایسے بھی ہوں گے جو مالک کی محبت اور وفاداری کے جذبے سے سرشار ہو کر کام میں مستغرق رہیں گے۔ ان کو کسی سے حسد ہوگا نہ رشک بلکہ وہ تو مالک کی محبت کی وجہ سے اس کی املاک میں کہیں بھی نقصان ہوتا دیکھیں گے تو اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑیں گے اور املاک کو نقصان سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ خواہ وہ جگہ ان کی ذمہ داری کے حدود میں ہو یا نہ ہو۔ نہ ان کو انعام کا لالچ ہوگا نہ سزا کا خوف۔ یہاں تک کہ یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ اگر مالک کی اس چیز کو ہم نقصان سے بچا لیں گے تو اس کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ بلکہ وہ تو جذبۂ وفاداری اور محبت میں سرشار ہونے کی وجہ سے ایسا کریں گے۔ ایسے ہی غلام وہ ہوں گے جو مالک کی نظر میں خاص وقعت حاصل کر لیں گے۔

مسلمانو! بے مثل و مثال آقا کے غلامو! ذرا غور کرو اور سوچو کہ مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے۔ کیا بخوف عذاب بندگی کرنے سے اس کی رضا حاصل کر سکتے ہو۔ معبودِ حقیقی کے بندو! کیا انعام کے لالچ میں بندگی کرنے سے اس کی خوشنودی میسر ہو سکتی ہے۔

ہاں اگر مالک سے محبت ہے تو بالکل بے غرض ہو کر بندگی کرو۔ اس کی املاک میں کہیں بھی نقصان ہوتا دیکھو اور جان پر کھیل کر اس کو بچانے کی کوشش کرو تو البتہ مالک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر ڈر سے کام کیا اور نفس خائف ہونے کی وجہ سے تم سے کام لیتا ہے تو یہ کام نفس کے حکم سے ہوا۔ لہٰذا بندگی خالص نہ ہوئی بلکہ نفس اس میں شریک ہو گیا۔ اگر انعام کے لالچ میں کیا تو نفس کو لذات کی خواہش

نے مجبور کیا۔ اس نے تمہیں مجبور کر کے کام لیا۔ اس میں بھی وہ شریک ہو گیا۔ لہٰذا یہ بندگی بھی خالص نہ ہوئی۔

خالص بندگی تو وہ ہی ہو گی جس میں خواہشات وجذبات نفس کی شمولیت نہ ہو۔ بلکہ خوف ولالچ سے بے نیاز ہو کر محض مالک کی محبت میں بندگی بجا لائیں۔ اس کا ثبوت خود خالق کے کلام میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ؀ — اللہ تو صرف متقین ہی سے قبول کرتا ہے۔

اور یہی قربانی کے ذکر میں ارشاد فرمایا:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ — اللہ کو ہرگز نہیں پہونچتا اس کا گوشت اور نہ اس کا خون۔ اس کو تو صرف تمہارے دل کا تقوے پہونچتا ہے۔

یعنی وہ خلوص جو تمہارے دلوں میں خدا کے لئے ہوتا ہے۔ صرف وہی اس کو پہونچتا ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کوئی عمل بھی ہو اگر وہ خالصۃً لوجہ اللہ نہیں کیا گیا تو فائدہ پہونچانے والا نہیں۔ نمازیں۔ روزے، حج، زکوٰۃ، ایثار، سخاوت، رحم وکرم، ہمدردی، خدمت خلق غرضیکہ کوئی عملِ خیر جس میں ہماری نفسانی خواہشات واغراض کی شمولیت ہو لائق ستائش نہیں ہوتا۔ تمام عبادات جن میں خلوص نہ ہو اور محض خدا کے لئے نہ ہوں، ناقص ہیں۔

اس کے علاوہ پہلے اس پر غور کریں کہ خدا تو نماز نہیں پڑھتا۔ روزہ نہیں رکھتا اور ورد ووظائف میں مصروف نہیں رہتا۔ نہ یہ اس کے کام ہیں۔ پھر ان

کاموں کو ہم نے عبادتِ حقیقی کیسے سمجھ لیا۔ یہ ریاضاتِ نفس ہیں جو عبادتِ حقیقی کا اہل بنانے کے لیے لازم قرار دی گئی ہیں۔ چونکہ خالق نے ہی ان کے بجالانے کا حکم دیا ہے اور یہی عبادتِ حقیقی تک پہونچانے کا ذریعہ ہیں لہٰذا انھیں عبادت اور عبادتِ مجازی ہی ہیں حقیقی عبادت تو وہی اعمال ہو سکتے ہیں جن سے مالک کی صفات کا ظہور ہو اور اس کی نیابت میں محض اس کی خوشنودی کے لئے عمل میں آئیں۔ ان کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱ ــــــــ وہ خالق ہے تو کبھی ایسا نہیں کرتا کہ آسمان سے آدمی بہ سادے یا زمین پھٹے اس میں سے نکل آئیں بلکہ اس نے اپنی سنت یہ مقرر فرمائی ہے کہ لوگ عقد کریں اور بچے پیدا ہوں۔ پس اگر یہ سب کام خوشنودیٔ خالق کے لیے کیے گئے اور صفتِ خالقیت کا حجاب بننے کے لیے ہوئے تو عبادتِ حقیقی ہیں اور اگر خواہشات و جذباتِ نفسانی کی تسکین کے لیے ہوئے تو بندگیٔ نفس اور شرکِ خفی ہیں۔

۲ ــــــــ وہ رب ہے، تمام عالموں کو پالنے والا ہے۔ اس نے بچوں کی پرورش کے لیے ماں باپ کو حجاب مقرر فرمایا ہے۔ اگر بچوں کی پرورش محض رب العزت کی خوشنودی کے لیے کی جائے، اس کی امانت جان کر ان کی خدمت و نگرانی کریں تو عبادتِ حقیقی ہوگی اور اگر جذبۂ حیوانی کی تسکین کے لیے ہو تو بندگیٔ نفس

۳ ــــــــ وہ رازق ہے تمام مخلوق کو رزق پہونچانا اس کا کام ہے حصولِ معاش کی کوشش کرنا صفتِ رازقیت کا مظہر بننا ہے۔ اگر کسبِ معاش رضائے الٰہی کے لیے کیا۔ صنعت و حرفت، محنت مزدوری وغیرہ میں اس کو مالک کا کام، اس کا فریضہ جانتے ہوئے مصروف رہا اور اس میں اپنی خواہشاتِ نفسانی شریک نہ کیں تو یہ تمام کام عبادتِ حقیقی ہوں گے۔

۴ ــــــــ ایک کاشتکار اپنی زراعت پر سخت محنت کرتا ہے تاکہ اس

کو منافع حاصل ہو۔ دوسرا کاشتکار اس نیت سے محنت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلہ اگانے، تاکہ لوگوں کے لیے اناج مہیا ہو سکے۔ پہلے کا کام اپنے نفس کی بندگی اور دوسرے کا عبادتِ حقیقی ہے۔

۵ —— اسی طرح تمام کاروباری زندگی۔ اس کی دنیا کو رونق دینا۔ اس کے شہروں کو آباد کرنا۔ اس کی مخلوق کی خدمت کرنا۔ اگر نام و نمود، عزت و شہرت کے حصول کے لیے ہیں۔ شرکِ خفی اور بندگی نفس ہیں اور اگر رضائے معبود کے لیے ہوں تو عبادت حقیقی ہیں۔

اِنَّما الاعمال بالنّیات — تمام اعمال کا دارو مدار نیت پہ ہے

مگر وائے بر حال ما! جب اپنی حیات دنیا کے ایک ایک عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو صرف آئندہ کے آرام و آسائش کے شوق یا آئندہ زندگی کی تنگ دستی اور پریشان حالی کے خوف سے کام کرتے ہیں۔ رضائے الٰہی کی تلاش و جستجو کا تو کبھی ہمیں خیال تک بھی نہیں آتا۔ ہماری زندگی کا کوئی کام مالک کے لیے نہیں ہوتا بلکہ تسکین جذبات کے لیے ہوتا ہے اگر مالک کی محبت میسر ہو جائے تو اعمال میں بے غرضی پیدا ہو جائے۔

افسوس کہ ہمیں دنیا کے مصائب و آلام و حوائج ہیں تو مالک یاد آتا ہے اور اس سے تڑپ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ ادھر مشکل حل ہوئی فوراً ہی اس کو بھول جاتے ہیں۔ ہماری اس کیفیتِ نفسی کو مالک نے کھول کر بیان کر دیا ہے:۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ	اور جب انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ لیٹے لیٹے، بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے پس جب ہم اس کی مصیبت دور

كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(پ - ع ۲)

کر دیتے ہیں تو اپنی پہلی رفتار پر چلنے لگتا ہے۔ گویا کہ اس نے وہ مصیبت دور کرنے کو جو اس پر پڑی تھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح گناہگاروں کے لیے وہ عمل زینت دیے گئے ہیں جو وہ کرتے تھے۔

(سورہ یونس - ع ۲)

افسوس کہ ہم بدنصیبوں کو یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ اس پیارے آقا کی محبت کا نور اس سے طلب کریں۔ اگر تڑپ تڑپ کر مانگیں تو مل جانا یقینی ہے مگر جب خواہش و طلب ہی نہ ہو تو ملے کیوں؟

پیغمبر اسلام صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہ تو اس واسطے آئے تھے کہ ہماری دنیا کو دین بنا دیں۔ مگر ہم نے دین کو بھی دنیا بنا ڈالا اور ہمارے تمام اعمالِ مذہبی بھی خوف و لالچ کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بن کر رہ گئے۔ حالانکہ یہی وہ ریاضات نفس ہیں جو ہماری زندگی کے تمام اعمال و افعال کو عبادت حقیقی بنا دینے کا ذریعہ ہیں۔

غرضیکہ ہماری حیاتِ دنیا کے تمام کام ان غلاموں کی طرح جن کا ذکر تمثیلاً اوپر گذر چکا خوف یا لالچ کے سبب سے ہوتے ہیں مگر غور طلب امر یہ ہے کہ یہ تمام غلام جو کاروبار ریاست مثل کاشتکاری، باغبانی وغیرہ میں مصروف ہیں، اور جو کام بھی ان کے سپرد کیا گیا ہے اس کو انجام دے رہے ہیں تو خواہ وہ سزا کے خوف سے کر رہے ہوں یا انعام کے لالچ میں کام تو آقا ہی کا ہو رہا ہے۔ بندگی تو مالک ہی کی کر رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس میں چونکہ ان کی خواہشات نفس شریک ہیں لہٰذا مالک کی رضا اور تقرب حاصل نہیں کر سکتے۔ آقا کی خوشنودی تو وہی غلام حاصل کرے گا جو مالک کی محبت میں

سرشار ہو کر اس کی وفاداری کے جوش میں ہر شے کو اس کی ملک سمجھتے ہوئے کام کرے۔

ایک اور مثال سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔ فرض کرو ایک شخص نے کچھ غلام ایسی حالت میں خریدے کہ وہ بالکل بے ہوش تھے۔ اسی حالت میں سب کو اپنے ایک باغ میں پہونچا دیا۔ جہاں رہائشی مکانات، اسباب خورد و نوش وغیرہ تمام ضروریات زندگی موجود تھیں۔ جب ان کو ہوش آیا اور تمام سامان مہیا پایا تو اس پر قابض ہو گئے اور جب یہ دیکھا کہ اس کی ملکیت کا کوئی مدعی نظر نہیں آتا تو تمام سامان کو اپنی ملک سمجھ لیا۔ باغ کو سینچنا، درخت لگانا، پودوں کی پرورش کرنا، اس کو رونق و ترقی دینا شروع کیا۔ مکانات کی مرمت و درستی کرتے رہے مگر یہ سب کچھ اپنی ملک سمجھتے ہوئے کیا۔ حالانکہ مالک کو کلّی اختیار ہے جس وقت بھی وہ چاہے ان کو اس باغ سے کہیں اور منتقل کر دے۔

ہر چند کہ ان کو کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ ہم کسی آقا کے غلام ہیں۔ نہ کبھی یہ خیال ہی آیا کہ یہ باغ یہ مکانات اور یہ تمام سامان کس کا ہے۔ اگر یہ خیال کرتے کہ تلاش کریں اس کا مالک کون ہے اور وہ کیا چاہتا ہے تو مالک کو پا لیتے اور اسی کی مرضی کے مطابق اس کی املاک میں تصرف کرنے سے اس کی خوشنودی بھی حاصل ہو جاتی۔

ہر چند کہ مالک کی جستجو نہ کی، اس کی مرضی کا علم ان کو حاصل نہ ہوا۔ مگر کام تو اسی کا کیا۔ اس کی ملک میں تصرف کیا، محنت کی، مکانات کی مرمت و درستی کی۔ باغ کو رونق دی، سینچا، پودے لگائے، ان کی پرورش کی۔ اس طرح بندگی تو مالک ہی کی کرتے رہے مگر نیت اپنے نفس کی۔

اسی طرح تمام جن و انس بھی دنیا کے مال و اسباب، ملک و املاک، اولاد و ازواج وغیرہ کو اپنا سمجھ کر اپنے خواہشات و جذبات کی تسکین کے لیے ان کی حفاظت و نگرانی، تربیت و پرورش کرتے ہیں۔ ان کو رونق و ترقی دیتے ہیں۔ شب و روز محنت و

مشقت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کا مالکِ حقیقی کون ہے اور تمام ایسے افراد اپنی خواہش کی تسکین کے لیے کھاتے ہیں جس سے تربیتِ جسم ہوتی ہے جو دراصل مالک کا کام ہے۔ اپنے جذبات کی خاطر عقد کرتے ہیں، اولاد پیدا ہوتی ہے۔ کام خالق کا ہوتا ہے۔ محبتِ حیوانی کے جوش میں اولاد کی پرورش کرتے ہیں، کام رب کا ہوتا ہے۔ تسکینِ جذبات کے لیے غلہ اگاتے ہیں، کام رازق کا ہوتا ہے عمارتیں سیرگاہیں بناتے ہیں۔ باغ باغیچہ لگاتے ہیں۔ بستیاں بساتے ہیں۔ شہر آباد کرتے ہیں، راستے اور سڑکیں بناتے ہیں، نہریں نکالتے ہیں مگر ملک تو تمام مالکِ حقیقی کی ہے۔ اس لیے کام اسی کا ہو رہا ہے۔

غرضیکہ تمام جن و انس ہر دم و ہر لحظہ اسی کی بندگی میں مشغول ہیں۔ ان میں سے بعض جو اہلِ شعور ہیں سب کچھ اسی کے لیے کرتے ہیں۔ ان کو رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے باقی سب غفلت و لاشعوری میں اپنے نفس کی بندگی کرتے ہوئے شب و روز معبودِ حقیقی کی عبادت میں مصروف ہیں۔ یہ ان کی بدنصیبی ہے کہ ان مشقتوں کے باوجود مالک کی رضا ان کو میسر نہیں ہوتی۔

اب تو بالکل واضح ہو گیا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کا کیا مطلب ہے۔ دوسرے مقام پر مالک نے اس مطلب کو زیادہ واضح فرما دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (پ۳ - ع ۱۷)	اور جو بھی آسمانوں زمین میں ہیں۔ سب اسی کی طاعت میں مصروف ہیں رغبت سے یا کراہت سے اور اسی کی طرف ان کی بازگشت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تمام جن و انس عبادت کے لیے پیدا کیے گئے

ہیں اور اسی کی بندگی میں مصروف ہیں۔ پس جو برضاء و رغبت بندگی خالق بجالاتے ہیں مستحق رضائے الٰہی ہیں۔ اور جو باکراہ عمل کرتے ہیں یعنی اپنی خواہشات و جذبات کی ایذار دفع کرنے کو کام کرتے ہیں وہ خوشنودیٔ خالق سے محروم رہتے ہیں۔

اب پھر ناظرین کو تمثیل زیرِ بحث کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو کچھ اس وقت تک بیان ہوا وہ انتظام و انصرام ریاست میں تقسیم کار کی پہلی صورت کے متعلق تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہر موضع میں مرکزی تنظیم قائم کی جاتے اور تمام کام مختلف شعبوں میں تقسیم ہوں۔ ایک مویشی خانہ ہو جس پر ایک شخص نگران ہو۔ آلات کار کا ایک ذخیرہ بنایا جائے جس پر ایک شخص نگران ہو۔ تمام غلاموں کی ضروریات زندگی کے لیے ذخائر قائم کئے جائیں، جو ایک شخص کی نگرانی میں ہوں۔ اسی طرح کاشتکاری، باغبانی، آبپاشی وغیرہ کے لیے علیحدہ علیحدہ شعبہ جات ہوں۔ ہر شعبہ کا ایک شخص ذمہ دار ہو۔ جملہ منتظمین کی نگرانی کے لیے ایک ناظم عمومی مقرر کیا جائے۔ باقی تمام غلاموں کو ان کی استعداد و اہلیت کے مطابق منتظمین کی ماتحتی میں دے دیا جائے اور تمام ریاست میں تحصیلیں قائم کی جائیں۔ جن میں سے ہر ایک پر ایک حاکم ہو۔ ہر تحصیل میں آٹھ آٹھ دس دس موضعے شامل ہوں۔ اسی طرح تین تین چار چار تحصیلوں سے ایک ضلع بنایا جائے جس پر ایک ضلعدار منتظم و متصرف ہو۔ اب ایک ناظم اعلیٰ کی بھی ضرورت ہوگی جو تمام ضلعداروں کے کام کی نگرانی کر سکے۔

ان تمام عہدیداروں کے علاوہ ایک جنرل سیکرٹری یا مختارِ عام کی ہر حالت میں ضرورت ہے جو تمام منتظمین وعمال کے کام کی نگرانی کر سکے۔ نیز خارجی معاملات کے لئے جہاں مالک اپنی جلالت قدر کی وجہ سے نہیں جا سکتا۔ اس کی نیابت بجالائے ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے جو تمام کاموں سے واقف اور ہر محکمہ کے حالات سے باخبر ہو۔

اس کے علاوہ مالک کے مزاج اس کی مرضی اور نجی حالات سے کماحقہ آگاہ ہو تاکہ جب کسی دوسری ریاست میں مالک کی طرف سے کوئی معاملہ طے کرنے جائے تو مالک کی مرضی اور اس کے خیالات کے مطابق رائے قائم کر کے معاملہ طے کر سکے اور ایسا شخص ہر زمانہ میں درکار ہوگا اور غلاموں ہی میں سے منتخب کیا جائے گا۔

لہذا حدود ریاست میں آباد شدہ غلاموں میں ایسے آدمی بھی ہونے چاہییں جن کے قوائے ذہنی کی اتنی تربیت ہو گئی ہو کہ سیاست کی گتھیاں اچھی طرح سلجھا سکیں جس کے لیے اچھے خاصے تعلیم یافتہ اشخاص کی ضرورت ہے۔ اور ایسے اشخاص غلاموں ہی میں سے بننے چاہییں۔

لہذا ضروری ہے کہ ہر غلام پر کچھ ایسے فرائض بھی عائد کئے جائیں جن سے تربیتِ ذہنی ہو سکے۔ پس جو ذہین اور بافہم ہوں گے، انتظام والصرام کے اہل ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں ریاست میں داخلی وخارجی فتنوں کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ جس کی روک تھام کے لیے فوجی تنظیم بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے ہر غلام کو فنونِ جنگ کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے۔

اب واضح ہو گیا کہ غلاموں پر تین قسم کے فرائض عائد کرنا ضروری ہے۔

۱—— سب سے پہلا فریضہ ریاست واملاک کا وہ کام جو اس غلام کے سپرد کیا جائے مثلاً کاشتکاری، باغبانی، محرری، پیمائش، آبپاشی، نظامت تحصیلداری، ضلعداری وغیرہ وغیرہ۔

۲—— دوسرا فریضہ حصولِ تعلیم بغرضِ تربیتِ قوائے ذہنی۔

۳—— تیسرا فریضہ حصولِ تعلیمِ فنونِ جنگ و ورزش وغیرہ بغرضِ تربیتِ قوائے جسمانی۔

اب چونکہ سب سے زیادہ ضروری تو کاروبار املاک ہے لہذا باقی ہر دو فرائض

کے لیے تقسیمِ اوقات کی ضرورت ہوگی۔ سب سے بہتر اوقات یہ ہوں گے۔

ا : قبل طلوعِ آفتاب گھنٹہ آدھ گھنٹہ تمام غلام اپنے اپنے حلقہ میں زبانی تعلیم حاصل کریں۔

ب : بعد طلوع اپنے اپنے فرائضِ منصبی میں مصروف ہوجائیں۔

ج : دوپہر کو کھانا کھانے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر تقریباً نصف گھنٹہ کے لیے اپنے اپنے حلقہ میں جمع ہوکر فنی تربیت حاصل کریں اور بعد فراغ کاروبارِ املاک میں مصروف ہوجائیں۔

د : شام کو پھر اپنے مرکز پر پہونچ کر فنونِ جنگ کی تربیت حاصل کریں۔

ہ : شب کو کچھ وقت کے لیے تحصیل علوم و تربیتِ قوائے ذہنی کے لیے جمع ہوں۔ اس کے بعد اپنے اپنے منصب پر پہونچ جائیں اور رات کا کچھ حصہ مطالعہ کتب پر صرف کریں۔

شب کے وقت تو ہر غلام تربیتِ ذہنی کے لئے وقت نکال سکتا ہے۔ کتب بینی کر سکتا ہے۔ جو تعلیم ابتدائے شب میں حاصل کی تھی اس پر غور وخوض کر کے ذہن نشین کر سکتا ہے۔ جن غلاموں کو اعلیٰ خدمات کے حصول کا شوق ہوگا وہ تو حصولِ تعلیم و تربیتِ قوائے ذہنی میں ضرور منہمک رہیں گے اور اپنے فرائضِ منصبی بھی تن دہی سے انجام دیں گے تاکہ کسی وقت مالک کی نظر ان پر پڑ جائے تو کوئی منصب اعلیٰ ان کو تفویض کر دے۔

مگر کیا کوئی غلام جو تربیتِ قوائے ذہنی یا ورزشِ جسمانی ہی کو فریضہ حقیقی سمجھ کر کاروبارِ املاک سے غافل ہو جائے یا ترک ہی کر دے، مالک کو خوش کر سکتا ہے؟ کیا ایسی حالت میں کہ جب کھلیان میں آگ لگ گئی ہو اور غلاموں کی ورزش کا وقت ہو مالک اس سے خوش ہو سکتا ہے کہ کسی غلام نے ورزش کرنا

نہ چھوڑا اور کھلیان جل کر خاکستر ہو گیا۔ یا ایک غلام جو فصل کی رکھوالی پر متعین ہو، تمام شب کتب بینی میں مصروف رہے۔ اور کھیتی کو جنگلی جانور برباد کر دیں۔ کیا صرف یہ کہہ کر مالک کے غضب سے بچ سکتا ہے کہ "میں تو حضور کے حکم کے مطابق مطالعہ کتب میں مصروف تھا"

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ ایک غلام جو کبوتر خانہ کے قریب وقتِ مقررہ پر ورزش کر رہا ہو اور کبوتر خانہ میں خود مالک ہی کی بلی داخل ہو جائے تو کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ کبوتروں کو بلی سے بچانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ ان کی حفاظت و نگرانی اس کے فریضۂ منصبی میں داخل نہ ہو۔ اگر بلی کبوتروں کو مار ڈالے تو کیا اس غلام کا یہ بیان اس کو مالک کے غضب سے بچا سکتا ہے کہ:۔

"میں تو حضور کے حکم کے مطابق ورزشِ جسمانی میں مصروف تھا جس کے لئے حضور ہی نے وقت مقرر فرمایا ہے"۔ صاحبانِ عقل غور کریں۔

قربان اس مالکِ حقیقی کے جس نے اپنے بندوں پر ایسے فرائض عائد کر دیے ہیں جن سے ان کے قوائے ظاہری و باطنی کی نشوونما ہوتی رہے تاکہ اس کی حقیقی بندگی کے اہل بن سکیں جو بغیر تزکیۂ نفس و صفائے باطن ممکن نہیں۔

اب پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ پیشتر بیان ہو چکا ہے کہ ریاست مذکورہ میں اس کی بھی ضرورت ہو گی کہ ہر موضع میں غلاموں کی ضروریاتِ زندگی، آلاتِ کاشت، خوراک و لباس وغیرہ کے ذخائر قائم کیے جائیں۔ جن کو انگریزی زبان میں سٹور (Store) کہتے ہیں اور ہر ذخیرہ پر ایک مہتمم یا سٹور کیپر مقرر کیا جائے تاکہ حسبِ ضرورت اپنے حلقہ کے غلاموں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ہر حکومت اپنے ملک میں فوجی مراکز پر سامان و اسباب کے ذخائر قائم

کرتی ہے۔ ہر ذخیرہ پر ایک ہتمم یا سٹور کیپر ہوتا ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ اگر کوئی سٹور کیپر سرکار کے مال کو اپنا سمجھ کر اپنے مصارف ذاتی پر خرچ کرنے لگے تو گو چند سال اپنی عیاری سے مامون رہے مگر بالآخر بوقتِ محاسبہ پکڑا جائے گا اور سزا یاب ہوگا۔

اسی طرح نقد رقوم کے لیے سرکاری خزانے ہوتے ہیں۔ ہر خزانے پر ایک خازن یا مہتمم خزانہ معین ہوتا ہے تاکہ وہ حسب ضرورت کارِ سرکار رقوم صرف کرنے کے لیے دیتا رہے۔ اگر کوئی خازن یا مہتمم اپنی تنخواہ سے زائد رقم نکال لیا کرے اور خزانے کو اپنے ذاتی مصارف پر صرف کرے تو بوقت محاسبہ اس پر غبن کا مقدمہ قائم ہوگا اور بالآخر سزا یاب ہوگا۔

قربان اس شہنشاہِ حقیقی کے جس نے اپنی سلطنت میں اپنے بہت سے بندوں کو خازن مقرر فرمایا ہے اور اپنے خزانے ان کے سپرد کیے ہیں۔ مگر افسوس کہ دنیا میں اکثر خزانچی دیانت سے کام نہیں کرتے بلکہ اس خزانے کو اپنی ملکیت سمجھ کر مصارف ذاتی پر صرف کرتے ہیں، حالانکہ مالکِ حقیقی نے اپنے محبوب کی زبانی ہم تک پیغام پہونچا دیا ہے اور تبلا دیا ہے:۔

اَلْاَغْنِیَاءُ خَزَنَۃُ اللّٰہِ
وَالْفُقَرَاءُ عِیَالُہٗ

مالدار اللہ تعالےٰ کے خزانچی ہیں اور اہل حاجت اس کے بال بچے ہیں۔

اب اہل دولت ہوشیار ہو جائیں اور سوچ سمجھ لیں، وقت محاسبہ قریب ہے، حساب دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اللہ کے بندو! ذرا غور کرو۔ آقا تو فرماتا ہے :۔

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں

ہے، سب کچھ اس کا ہے۔

ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام مال و دولت، اسباب و جائداد وغیرہ سب ہماری مِلک ہیں۔ ہم ہی بلا شرکتِ غیر اس کے مالکِ مستقل ہیں۔ یہ ہمارے عیش و عشرت کے لیے ہے۔ مسلمانو! سوچو اور غور کرو۔ معلوم نہیں کس وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑے اور اس اسٹور کا چارج دوسرے سٹور کیپروں کے حوالہ کرنا پڑے۔

میں اصل مقصد سے کچھ دور ہو گیا۔ عرض کرنا یہ مقصود تھا کہ اس ریاست کے نظام میں جس کی مثال ناظرین کے زیرِ نظر ہے۔ ہر غلام کو ترقیٔ قوائے ذہنی و جسمانی کی فکر ہوگی اور ہر ایک یہی کوشش کرے گا کہ کوئی اعلیٰ خدمت حاصل کر سکے لہٰذا جن غلاموں میں اہلیت پیدا ہوتی جائے گی، اعلیٰ مناصب پر متعین ہوتے رہیں گے۔ پھر ان اعلیٰ عہدیداروں میں سے بعض اور ترقی کریں گے۔ یہاں تک کہ اِن ہی میں سے ایک شخص مختارِ عام کی منزلت پر پہونچ جائے گا۔

ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ اک غلام کی ترقی کی حد یہ ہے کہ وہ ریاست کا مختارِ عام ہو جائے۔ مگر نہیں۔ اس کی منزلِ کمال تو یہ ہے کہ وہ مالک کو اپنا لے اور ایسی خدمات کرے کہ اس کے مزاج میں دخیل ہو جائے تاکہ مالک تمام کام اس پر چھوڑ دے اور وہ مالک کی مشیت و ارادے کا "محل" بن جائے۔ جو شخص مزاجدان نہ بن سکے گا۔ اس عہدۂ جلیلہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ اک صاحبِ فہم و ذکاء تو مالک کی مرضی بغیر بتلائے ہی سمجھ سکتا ہے اور وہی مالک کی نیابت کا اہل ہو سکتا ہے۔ مگر کم فہم غلاموں کو ہر کام کے لیے مفصل ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص مالک کی نیابت کر ہی نہیں سکتے۔

بعض اشخاص تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو جزئیات کے لئے مفصل ہدایات نہ کی جائیں تو تمام کام خراب و برباد ہو جائے۔ اس کی ایک مثال ہدیۂ ناظرین ہے۔

مثال

ایک شخص سفر کو جاتے ہوئے ملازم سے کہہ گیا کہ مکان کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ ان بیش قیمت قالینوں کو جو کمرے میں بچھے ہوئے تھے دیمک لگ گئی ہے ملازم سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا کہ "حضور نے مکان کی دیکھ بھال کا حکم دیا تھا۔ فرش کے لیے تو کچھ فرمایا ہی نہیں تھا۔"

ایک مثال اور بھی ملاحظہ فرمالیں۔ ایک نواب صاحب نے ایک غلام خریدا۔ بائع نے آگاہ کر دیا کہ اس غلام میں ایک سخت عیب ہے جس کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بغیر کہے کوئی کام نہیں کرتا۔ نواب صاحب نے کہا یہ تو کوئی عیب نہیں۔ غلام کو گھر لے آئے۔ ہر حکم کی فوری تعمیل کرتا تھا۔ بہت خوش ہوتے۔ کہنے لگے۔ اس کو خواہ مخواہ ہی عیب لگاتے تھے۔

نواب صاحب کے پاس ایک نہایت بیش قیمت مرصع مصلیٰ تھا۔ جس کو صرف عیدین میں استعمال کرتے تھے۔ عید آئی تو غلام کو حکم دیا کہ یہ مصلیٰ عید گاہ لے جاؤ اور امام کے پیچھے پہلی صف میں بچھا کر اس کے قریب بیٹھ جاؤ۔ جب تک ہم نہ آئیں، اس کی حفاظت کرو۔ نواب صاحب نماز میں شریک ہوئے۔ واپس آگئے۔ دوسرے روز مصلیٰ یاد آیا۔ غلام سے دریافت کیا کہ تم عید گاہ سے مصلیٰ لے آئے تھے؟ غلام نے عرض کی۔ حضور نے لانے کا حکم تو دیا ہی نہ تھا۔

ناظرین غور کرو۔ کیا ذی فہم اشخاص ایسا کر سکتے ہیں؟ کیا سمجھدار غلاموں سے ایسا کام ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ تو مالک کی مرضی کو اپنے فہم و ذکا سے سمجھ لیتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ مالک کی املاک میں کس طرح تصرف کیا جائے جو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ اسی کی تائید میں ایک چشم دید واقعہ ناظرین کی

نذرانے میں پیش کرتا ہوں۔

ایک رئیس صاحب کو اپنا اک ملازم تمام عزیز واقارب سے زیادہ محبوب تھا ایک روز چند اعزہ نے اس کی بدسلوکیوں کی شکایت کی۔ رئیس صاحب سن کر خاموش رہے اور اس سے کوئی بازپرس نہ کی۔ اس پر سب کہنے لگے کہ آپ کی حد درجہ نرمی نے اس کو ایسا گستاخ بنا دیا ہے کہ آپ کے اعزہ سے بھی بدسلوکی کرتا رہتا ہے۔ اگر اس کی فہمائش کرتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

رئیس صاحب نے جواب دیا کہ یہ ملازم مجھ کو بے حد عزیز ہے۔ اگر آپ لوگ اس کا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں تو آپ میں سے ایک شخص چند روز میرے پاس قیام کرے۔ حقیقت اس پر آشکار ہو جائے گی۔

چنانچہ انہیں سے ایک صاحب نے رئیس صاحب کے پاس قیام کیا۔ تو دیکھا جب کھانے کا وقت ہوا اور دسترخوان بچھایا گیا تو رئیس صاحب نے فرمایا۔ آج فلاں ترکاری ہوتی تو کیا ہی خوب ہوتا۔ جب کھانا چنا گیا تو وہی ترکاری دسترخوان پر موجود تھی۔

اسی طرح وہ عزیز صاحب دوران قیام مشاہدہ کرتے رہے کہ رئیس مذکورہ کو جس چیز کی خواہش ہوتی وہ ملازم بغیر اس کے کہ آقا نے پہلے اس کا اظہار کیا ہو وہی شئے کھانے کے وقت پیش کر دیتا تھا۔

پس ایک روز رئیس صاحب نے عزیز مذکور سے فرمایا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ ملازم مجھے کیوں اس قدر عزیز ہے کہ میں اس سے کسی بات کی بازپرس نہیں کرتا۔

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ کیا بات تھی۔ کیا اس ملازم کے پاس کوئی سفلی یا علوی عمل تھا؟ کیا وہ جادوگر تھا۔ نہیں ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ تربیتِ قوائے ذہنی کا اثر تھا کہ آقا کے دل میں جو خواہش پیدا ہوتی تھی۔ ملازم کا ذہن اس کا اثر قبول

کر لیتا تھا۔ اس کو مزاج دانی کہتے ہیں جس شخص کے قوائے ذہنی کی پوری پوری تربیت ہو جاتی ہے اس میں یہ اہلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک دوسرے شخص کے پاس رہ کر اس کی مرضی کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔

اب ناظرین کو اصل مقصد کی طرف پھر توجہ دلاتا ہوں کہ تمثیل پیش نظر میں ریاست کے تمام غلاموں میں سے جو شخص جملہ امور انتظامی میں مہارت تامہ حاصل کر چکا ہو اور مالک کا مزاجداں بھی ہو جائے۔ یہاں تک کہ مالک کے منشاء کو بغیر بتلائے ہی سمجھ سکے۔ تو کیا ایسا بندہ اپنے آقا کی تمام املاک پر اختیار کلی حاصل نہ کر لے گا۔ ضروری ہے کہ ایسے غلام کو آقا اپنی تمام املاک میں تصرف کامل کے اختیارات عطا کر دے اور تمام غلاموں پر آقا کے بجائے اس کی طرف سے حکم کرنے والا یہی بندہ ہو جائے۔

اب غور کریں کہ بندگی کا کمال کیا ہے۔ کمال عبدیت یہ ہے کہ عبد اپنے معبود میں فنا ہو جائے یعنی بندہ کی ہر خواہش آقا کے منشاء کے مطابق ہو۔ اس طرح عبد کی رضا معبود کی مرضی اور معبود کی رضا عبد کی مرضی ہو جائے۔ اس مقام پر پہنچ کر بندہ کو مالک کی املاک میں حق تصرف حاصل ہو جائے گا اور چونکہ یہ تصرف مالک کی مرضی سے اس کی نیابت میں ہوگا لہٰذا متصرفِ حقیقی خود مالک ہی ہوگا نہ کہ مملوک۔ وہ تو صرف اک آلہ کار ہے۔

یہاں تک تو معبودانِ مجازی ہی کی عبادت کا ذکر ہے۔ اب غور کریں کہ معبودِ حقیقی کی عبادت کے منازل کیا ہیں۔ جن بندوں کو اس نے خود اپنے "عبد" کا خطاب عطا فرمایا۔ ان کے مراتب کیا ہوں گے۔ ان کی بندگی کس قدر عظیم ہوگی۔

ہمارے لیے تو ان بندوں کی عبادت ہی کا سمجھنا مشکل ہے جو بہ تدریج عبدیت میں ترقی کرتے کرتے فنا پر فائز ہو جاتے ہیں۔ پھر ان بندوں کی عبادت کے متعلق ہم کیا تصور کر سکتے ہیں جو پیدا ہی "عبد کامل" ہوتے ہوں۔ وہ ہی تو خلیفۃ اللہ، اس کے

اصلی نائب ہوں گے۔ وہی بندے صفاتِ الٰہیہ کے مظہر کامل ہوں گے۔ تب ہی تو وہ یہ تعلیم دینے کے لیے منتخب کیے جائیں گے کہ:۔

اے دنیا والو! اے انسان نما حیوانو! تم رب کے بندے بن جاؤ تاکہ تم فرشتوں سے افضل ہو جاؤ اور تم میں آقا کے صفات نظر آنے لگیں "

چنانچہ ایک عبدِ کامل دنیا میں رب کا پیغام پہونچانے آیا۔ اس نے سب کو سنایا: ایھا الناس تخلقوا باخلاق اللّٰہ (لوگو! تم اپنے میں صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو۔

دنیا کا یہی قاعدہ ہے کہ ہر دار العلوم میں کسی علم یا فن کا معلم وہی مقرر کیا جاتا ہے جس کو اس علم یا فن میں مہارت تامہ حاصل ہو۔ اب غور کریں کہ جو بندہ حصولِ صفاتِ الٰہیہ کے طریقے سکھانے کے لیے منتخب کیا گیا ہو، وہ خود کیا صفاتِ الٰہیہ کا حامل نہ ہوگا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ہم تو وہم و گمان ہی نہیں کر سکتے کہ ایسا بندہ ان صفات میں کس قدر بلند منزل کمال پر فائز ہوگا۔ خدا کے اس بندے کی منزلت سمجھنا ہماری عقل و فہم کی رسائی سے بالاتر ہے۔ خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں۔ انسان کا کیا ذکر فرشتے بھی یہی کہیں گے ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم! فروغِ تجلّی بسوزد پرم!

اللھم صل علیٰ عبدک وحبیبک محمدن المصطفیٰ سید الانبیاء والمرسلین و الہ الطاھرین کافضل ما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید (آمین)

عبدیّت!

عبادت کی تشریح کے بعد اس کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ "عبدیت" کی بھی کچھ وضاحت ہو جائے۔ اتنا تو ہر فرد جانتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی بندگی کرنی چاہے تو ضروری ہے کہ پہلے اس کا غلام تو بنے، ورنہ کسی شخص کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر ملازمت اختیار کیے کسی حکومت کی خدمت انجام دے سکے اور غلام اس وقت بن سکتا ہے جب غلامی حاصل کرنے کے لیے اس حکومت کے سوائے سب کو چھوڑ دے۔ کسی دوسری حکومت یا کسی دوسرے حاکم کی حکم برداری نہ کرے بلکہ سب سے منہ موڑ کر صرف حکومت کا ہو جانے کا ارادہ کر کے دفتر حکومت میں پہونچے۔ عہد نامہ پُر کرے تب کہیں حکومت کی غلامی میں داخل ہو سکتا ہے۔

ہر ملک میں کروڑوں افراد ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں۔ جن کے ذرائع آمدنی ان کی کفالت کے لیے کافی و وافی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو تلاش ملازمت کا خیال ہی نہیں آسکتا جس کو اپنی احتیاج کا احساس ہوگا۔ اسی کو ملازمت کی تلاش ہوگی اور ایسا شخص ہی حصول ملازمت کے لیے درخواست کرے گا۔ اگر درخواست منظور ہو جائے تو عہد نامہ پُر کر کے ہی ملازمت حاصل ہوتی ہے۔

ہم کو چاہیے کہ اپنے نفسوں سے خطاب کریں اور توجہ دلائیں کہ غور تو کرو، جب ایک مادی حکومت کا خادم یا غلام بننے کے لیے گھر بار، بیوی، بچے، عزیز و اقارب، دوست، احباب، کھیل، تماشے سب کچھ چھوڑ کر سب سے منہ موڑ کر

حکومت کے دفتروں میں جاتے ہیں اور کتنے ہی چکر لگاتے ہیں، تب کہیں حکومت کی غلامی میں نام لکھا جاتا ہے۔ تو پھر سب سے بڑی حکومت نورانیہ کی غلامی بغیر کسی قربانی کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

اے نفس امّارہ پہلے بندگیٔ شہوات و ہوے سے تو نکل۔ دیکھ مولائے جلیل فرماتا ہے:-

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ○	اے حبیبؐ۔ کیا تم نے اُسے دیکھا جس نے جذبات ہی کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ پھر تم اس کے امور کی درستی کرنے والے کیسے ہو سکتے ہو۔

(پ ۱۹۔ ع ۲)

پس جب تک ہم ہوی و ہوس کی بندگی سے نہ نکلیں گے ہماری نمازیں روزے حج، زکوٰۃ، قربانی اور ورد و وظائف اگر "میرے مذہب" کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنتے رہیں اور صرف رواسم کی پیروی تک محدود ہوں، نفس پرستی ہی میں شامل رہیں گے اور ہم شرکِ باطنی میں مبتلا رہیں گے۔ غفلت و لاشعوری بڑھتی جائے گی، جس کا نتیجہ خسران ہی ہو گا۔ اور ہم رحمتِ ایزدی اور عالمِ نور تک پہونچ نہ سکیں گے۔

اتنا تو ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ غلام کو اپنے آقا کا حکم سب سے زیادہ محبوب ہونا چاہیے کہ وہ اسی کی اطاعت کرے۔ مالک کے سوائے کسی غیر کو اس سے زیادہ یا اس کی مثل محبوب نہ رکھے۔ اب جس حاکمِ اعلیٰ و اجلؐ کی بندگی کا ہم دعوے کرتے ہیں اور فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہوئے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اس کے بندے ہیں۔

اس کا فرمان دیکھ لیں۔ وہ تو ارشاد فرماتا ہے:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○

کہدو اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ قبیلہ، اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جو تم کو پسند ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کوشش، کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ عذاب لائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(پ ۱۰، ع ۹)

یہ ہیں بندگی کے شرائط جو عقل و فطرت کے عین مطابق ہیں۔ مالک اُسی کو ہدایت کرتا ہے یعنی اسی کو اپنا بندہ بناتا ہے جو بندگی کے یہ شرائط پورے کرے اور ان سب چیزوں کو مالک کی حکم سے زیادہ عزیز نہ رکھے، تب ہی اس کی بندگی میں نام لکھا جا سکے گا۔

پہلے اس پر تو غور کریں کہ کسی کی بندگی یا ملازمت وہی شخص اختیار کرتا ہے، جس کو اس کی خواہش ہو اور خواہش اسی وقت ہوتی ہے جب نفس کو ضرورت کا احساس ہو۔ ضرورت کے احساس ہی سے کسی غنی کی جستجو ہوتی ہے تاکہ اس کی طرف متوجہ ہو۔

پس جس ذات کے غنی ہونے کا نفس کو شعور ہوگا، اسی کی طرف توجہ کرے گا۔

پھر جب ہم کو ضرورت کا احساس ہی نہیں تو حصولِ عبدیت کی خواہش ہی کیوں پیدا ہو اور بغیر خواہش کے غنی المغنی کی طرف توجہ ہی کیوں ہو۔ اگر کسی وقت عجز واحتیاج کا احساس ہو بھی گیا تو اس وقت بھی اسی ذات کی طرف توجہ ہو گی جس کے غنی ہونے کا نفس کو پہلے سے احساس ہو۔ معبودِ حقیقی کے وجود اور اس کے غنی ہونے کا تو نفس کو احساس ہی نہیں اس لیے کہ غیب کا احساس تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا تو ادراک ہو سکتا ہے وہ بھی طلب و کوشش کے بعد۔ لہٰذا جس ذات کا احساس و شعور نہیں اس کی طرف توجہ کرنا کیسے ممکن ہے۔

پہلے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ نفس کو اس کا احساس ہو جائے کہ میں فانی ہوں کسی طرح بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ تب ہی تو اس کو طلب ہو گی کہ کسی غیر فانی ذات باقی کو تلاش کروں جو میری بقا کا ذریعہ ہو جائے اور جب تک اس ذات کی بقاء دائمی کا یقین نہ ہوگا اس کی طرف نفس کی توجہ نہ ہو گی۔

اسی طرح نفس کو پہلے اس کا احساس ہو جائے کہ میں نہایت ذلیل، نافہم، جاہل، نادان، عاجز و ضعیف چھوٹا سا مجسمہ ہوں۔ اس وقت ہی تو اس کو ایسی ہستی کی تلاش ہو گی جو اس کے نقائص کو کمالات سے بدل دے اور اس ہستی کی طرف اس کو اسی وقت توجہ ہو سکتی ہے جب اس کی کبریائی، عظمت، حکمت و قدرت، ہمیشہ باقی رہنے، ہر شئے پر قادر ہونے کا بھی یقین ہو گیا ہو۔

جب نفس کو اس کا شعور ہو جائے کہ میں حیاتِ حقیقی سے محروم ایک میت ہوں اور حصولِ حیاتِ حقیقی کی کوشش کرنا ضروری ہے، اس وقت ہی حی و قیوم کی طرف متوجہ ہوگا، جب تک ہوئی و ہوس، خواہشات و جذبات پر غلبہ حاصل نہ ہو اور نفس کشی نہ کرے جس کے لیے مولائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :-

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا مرجاؤ قبل اس کے کہ تم مرو۔

اس وقت تک اس کو یہ احساس ہو ہی نہیں سکتا کہ میں حیاتِ حقیقی سے محروم ایک میت ہوں۔

اسی طرح جب نفس کو یہ احساس ہوگا کہ اس دنیا میں کوئی شے میری نہیں، اسی وقت تو ان کے مالک حقیقی کی طرف توجہ کرے گا اور یہ خواہش پیدا ہوگی کہ کس طرح مالک تک پہونچ جاؤں اور میں اس کا ہو جاؤں تو یہ سب کچھ میرا ہو جائے۔

غرضیکہ جب تک نفس کو اپنے ناقص ہونے کا احساس نہ ہوگا، کامل کی تلاش ہی کیوں کرے گا اور کامل کے کمال کا جب تک شعور نہ ہوگا اس کی طرف راغب ہونا ممکن نہیں۔ جب ذاتِ کامل کی عظمت و کمال کا یقین ہو جائے گا تو پھر لازمی امر ہے کہ اس بارگاہِ عظمت و جلال کی غلامی کے حصول کی خواہش پیدا ہو جائے۔ جب اس کی بندگی طلب کرے گا اور اس کی غلامی مل جائے گی اور اس حکومت کا سپاہی بن جائے گا تو حکومت کی عزت، حکمت، قدرت، جلال و عظمت، شان و شوکت میں تھوڑا بہت حصہ اس کو بھی عطا ہو جائے گا۔

اس لئے کہ جس وقت بھی کوئی شخص کسی حکومت کی غلامی میں داخل ہوتا ہے مثلاً پولیس کا کانسٹیبل یا چپراسی ہی ہو جاتا ہے، اسی وقت حکومت کی شان و شوکت، عزت و قوت کا تھوڑا بہت جز خواہ کتنا ہی قلیل ہو اس کو مل جاتا ہے کہ وہ عوام سے ممتاز ہو جاتا ہے اور امورِ حکومت میں تھوڑا بہت دخیل ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو حکومت کی نیابت ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ہر حکومت کی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمت یا غلامی کے لئے کچھ نہ کچھ استعداد یا قابلیت ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً دفاتر کی ملازمت کے لیے حکومت کے مقررہ و منظور کردہ امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ پولیس

اور فوج کے سپاہی کے لیے جسمانی اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میڈیکل اگزامینیشن، یعنی ڈاکٹری ہر ایک کی ہوتی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے نفس سے سوال کریں کہ اے غافل، لاشعور! کیا آسمانی حکومت کی غلامی کے لیے کوئی امتحان مقرر نہ ہوگا؟ کیا اس کے لیے کسی استعداد و قابلیت کی ضرورت نہ ہوگی؟ کیوں نہیں ہے اور ضرور ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلی چیز اصلاحِ نفس ہے تاکہ فطرتِ صحیحہ بے حجاب ہو جائے اور ہر حرکت، ہر عمل عین مطابقِ فطرت صادر ہونے لگے۔ یہی عبادتِ حقیقی اور یہی علامت عبدیت ہے اسی کے لیے جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ ارشاد فرماتا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ
(سورہ جمعہ ۱)

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں جو بادشاہ ہے قدوس ہے عزت و حکمت والا ہے۔

غرضیکہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے ہر شے اس کی تسبیح میں مصروف ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ تسبیح کرنے یعنی پاکیزگی بیان کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا ہماری طرح سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتی رہتی ہیں۔ نہیں بلکہ اس کی سبحانیت اور پاکیزگی کا اظہار کرتی رہتی ہے کہ عین مطابقِ فطرت عمل ہو رہا ہے۔ ہر شے قوانینِ فطرت پر عمل کرتے ہوئے اس کی پاکیزگی کا اظہار کر رہی ہے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی شے میں عیب نکال سکے تو پھر ان کا خالق کیسا بے عیب ہوگا۔ اسی کی طرف خالقِ کائنات ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ
الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

اور وہ غلبہ والا سب سے زیادہ
بخشنے والا ہے۔ جس نے سات

طِبَاقًا ط مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۝

آسمان تہ بتہ خلق کیے۔ تم خدائے رحمان کی خلقت میں کوئی اختلاف نہ پاؤ گے۔ پھر نظر ڈالو کیا تم کوئی عیب دیکھتے ہو؟ پھر بار بار نظر ڈالو۔ وہ نظر تھک کر ذلیل ہو کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔ (یعنی کوئی خلل و عیب نظر نہ آسکے گا)

(سورۃ ملک پ ۲۹)

اب تو ہر شے کے تسبیح کرتے رہنے کا مفہوم واضح ہو گیا کہ خالق کی پاکیزگی اور اس کے عیبوں سے منزہ ہونے کا عملی طور پر اظہار کرنا ہی حقیقی تسبیح ہے اور یہی شانِ عبدیت ہے۔

سورہ رحمٰن میں بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝

(پ ۲۷)

بیلدار پودے اور درخت سجدہ ہی کرتے رہتے ہیں۔

اب سجدے کے معنی اور اس کا صحیح مفہوم بھی سمجھنا ضروری ہے۔ کیا زمین پر سر ٹیکنے ہی کو سجدہ کہتے ہیں؟ اگر سجدہ کے یہی معنے ہوں تو پھر تلاش کرو اور دریافت کرو کہ کسی شخص نے کبھی کیا کسی پودے یا درخت کو زمین پر ماتھا ٹیکتے دیکھا ہے۔ نہیں، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اگر سجدے کے حقیقی معنے معلوم کرنے ہوں تو قرآن ہی سے دریافت کریں۔ وہ خود ہی بتلائے گا کہ "سجدہ" سے کیا مراد ہے اور درخت اور پودے کس طرح سجدۂ خالق میں مصروف رہتے ہیں۔ دیکھئے جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔

نوٹ: یہ آیہ سجدہ ہے۔ آواز سے پڑھنے پر سجدہ کرنا لازم آتا ہے۔ دل ہی دل میں بغیر آواز کے پڑھ سکتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کو سجدہ کر رہے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سے لوگوں میں سے بھی۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب لازم ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہو سکتا اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(سورہ حج۔ ع ۲۔ پ ۱۷۔ ع ۹)

دیکھیے ہر شخص جانتا ہے کہ سجدہ افضل ترین عبادات ہے۔ لائق غور امر یہ ہے کہ سجدے کے معنے کیا ہیں۔ اور سجدہ کس کو کہتے ہیں۔

اس آیہ قرآنی ہدایہ میں سجدے کے معنے واضح کر دیے گئے ہیں۔ اگر غور کریں تو سجدے کا مفہوم بالکل واضح ہو جائے۔ یہاں انسان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اے بے بصیرت دیکھ، تمام مخلوق جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے سجدہ خالق میں مصروف ہے۔ پس معلوم ہوا کہ فطرت کے مطابق عمل کرنا۔ اس سے سر مو تجاوز نہ کرنا ہی افضل ترین عبادات ہے اور یہی سجدہ حقیقی ہے۔

دیکھیے قرآنِ پاک کس طرح کھول کھول کر بیان کر رہا ہے کہ اے غافل انسان! دیکھ تمام مخلوق سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور کچھ لوگ عین مطابقِ فطرت عمل کر رہے ہیں اور قوانینِ فطرت سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ صرف تو ہی ایسا بدبخت ہے کہ تیرے ہم جنس اپنی فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے تو بتلا دیا ہے کہ اصل دین اور حقیقی اسلام یہی ہے کہ بندہ اپنی اس فطرت کے مطابق عمل کرے جو خالق نے اس کے اندر ڈالی ہوئی ہے۔ جیساکہ ارشاد ہے :-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(پ ۲۱۔ ع ۷۔ سورہ روم ع ۴)

پس اپنے نفس کو قائم کرے دین کے لئے یکسو ہوکر۔ اللہ کی وہ فطرت جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی تو مضبوط دین ہے۔ لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

خالق نے تو بتلا دیا تھا کہ وہ فطرت جو تیرے اندر اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اس کے عین مطابق عمل کرنا ہی اصل اسلام اور حقیقی دین ہے۔ کیا ہر بچہ یہ فطرت لے کر پیدا نہیں ہوتا کہ میں "سب سے اچھا"۔ پس اس کو لازم تھا کہ سب سے اچھا بنے اور بنا رہنے کی کوشش کرتا رہے۔ یہ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

مگر چونکہ اچھا بننے کی کوشش سے نفسِ امّارہ کو اذیت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اس سبق کو بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے بجائے یہ خواہش ہو جاتی ہے کہ میں اچھا سمجھا جاؤں۔ مجھے کوئی برا نہ کہے۔ مگر اس کو بھلائے

رہنے کے باوجود جب کوئی اس کو بُرا کہتا ہے تو وہ بھولا ہوا سبق یاد آجاتا ہے اور بُرا کہنے والے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ فطرت ابھر آتی ہے کہ "میں اچھا" اور یہ کبھی نہیں بدلتی۔

کائنات کی ہر شے کو دیکھ جائیے کہ اپنی فطرت پر عمل کرتے ہوئے ہر ایک کو دعوت دیتی رہتی ہے کہ دیکھو کیا تم میرے اندر کوئی عیب نکال سکتے ہو۔ پس جب میرے اندر کوئی عیب و نقص نہیں تو میرا خالق کیسا پاک و پاکیزہ اور ہر عیب سے منزہ ہوگا۔ کائنات کی تمام مخلوق میں صرف ایک انسان ہی ایسا بدبخت ہے کہ اس کے اکثر ہم جنس خالق کی پاکیزگی کا اظہار نہیں کرتے اور اپنی فطرت کے خلاف بداعمالیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

اے غافل انسان! کائنات کی ہر شے پر نظر ڈال کر دیکھ کہ وہ کس طرح ہر دم و ہر لحظہ اپنے خالق کی تسبیح کرنے، اس کے منزہ اور بے عیب ہونے کا اپنے عمل سے اظہار کرتی رہتی ہے۔

آفتاب کو دیکھ کہ وہ اپنی شعاعیں پھیلاتا ہے۔ تمام مخلوق کو نور بخشتا ہے۔ اس کا فیض چرند و پرند، انسان و حیوان، شجر و حجر، بینا و نابینا سب کے لیے یکساں ہے وہ نور روشنی دے رہا ہے جو چاہے فائدہ اٹھائے۔ جس میں اہلیت ہو فیض حاصل کرے۔ اسے تو کسی سے کوئی غرض نہیں۔ اس کی اپنی کوئی خواہش نہیں۔ وہ کسی سے کچھ نہیں چاہتا۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

چاند کو دیکھیں کہ دریا، پہاڑ، صحرا، آبادی، بیابان، نخلستان، ریگستان، حیوان و انسان سب کو یکساں روشنی دیتا ہے۔ اپنی معینہ گردش سے سر مو تجاوز نہیں کرتا۔ نہ کسی سے دوستی نہ دشمنی۔ نہ کسی سے کوئی خواہش نہ غرض۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

ستارے، سیارے، تمام اجرام فلکی اپنے معینہ محور پر گردش کر رہے ہیں۔ اپنے مقررہ راستے پر شب و روز سرگرم سفر ہیں۔ رات کو چمک کر تاریکی کو کم کرتے ہیں۔ اندھیرے میں سمندروں اور بیابانوں میں راہ دکھاتے ہیں۔ تمام مخلوق کو یکساں فائدہ پہونچاتے رہتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی غرض نہیں۔ یہی شان عبدیت ہے۔

پہاڑوں کو دیکھو زمین کے سینہ کو مضبوطی سے دبائے فضا میں سر بلند کیے کھڑے ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے لیے ہر دم کمر بستہ رہتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ ہوائیں پانی لیے ہوئے گذر جائیں۔ فوراً روکیں گے اور اپنے دامن میں بسنے والے جنگلات کو بارش سے مالا مال کر دیں گے۔ زمانہ سرما میں دھیان رہتا ہے کہ گرمی کا موسم آرہا ہے۔ زمین اور اس پر بسنے والے پیاسے ہوں گے، ان کو سیراب کرنا ضروری ہے لہذا اپنی چوٹیوں پر منجمد پانی کے خزانے جمع کر لیتے ہیں اور بہم رسانی آب کے لیے کروڑوں ٹن برف کے تودے اپنے سروں پر اٹھائے وقت کے منتظر رہتے ہیں اس طرح بہم رسانی آب کا بند و بست کرتے ہیں کہ شب و روز مخلوق خدا کو پانی پہونچاتے رہیں۔ موسم گرما شروع ہوا اور برف کے تودے پگھل پگھل کر پیاسی زمین کو سیراب کرنے لگے۔ پانی چوٹیوں پر سے اترا اور پہاڑ اپنی ہر ایک گھاٹی اور وادی میں اس کو تقسیم کرنے لگے۔ ان کو اپنی کوئی غرض نہیں۔ کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ یہی شان عبدیت ہے۔

درختوں کو دیکھو کس طرح سجدۂ خالق میں مصروف ہیں۔ ہر درخت مخلوق خدا کے لیے سایہ بہم پہونچاتا ہے۔ اس کے سایہ میں جو بھی چاہے بیٹھے۔ اس سے فائدہ اٹھائے۔ دیکھو وہ ایسا تو نہیں کرتا کہ ایک بادشاہ یا امیر پر زیادہ خنک سایہ ڈالے اور ایک فقیر و محتاج پر کم۔ نہیں بلکہ اس کا فیض تو شاہ و گدا، امیر و غریب مسافر و مقیم، عالم و جاہل، برہمن و شودر، زاہد و فاسق، مومن و کافر، دوست و

دشمن سب کے لیے یکساں ہے۔ وہ پھل لاتا ہے۔ رب کے نام پر نچھاور کرتا ہے۔ صدائے عام دیتا ہے۔ خدا کے بندو! یہ مالک کا صدقہ ہے کھائے جس کا جی چاہے۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کسی ایسے شخص کو جس نے اس کی شاخیں کاٹی ہوں، اپنے فیض سے محروم رکھے یا اپنے سینچنے والے کو دوسروں پر ترجیح دے۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو اپنے خالق کی پاکیزگی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ عملی طور پر دکھلاتا ہے کہ میرے رب کی رحمت دوست و دشمن، مطیع و نافرمان، کالے گورے سب کے لیے یکساں ہے جو بھی چاہے، جس کو بھی اس کی طلب ہو فیض حاصل کرے۔ وہ تو گبر و ترسا، یہودی، نصرانی، مسلم و مشرک، کافر و مومن سب کو یکساں رزق پہونچاتا ہے۔ اب بھی سمجھ میں آیا کہ درخت کس طرح اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کس طرح بارگاہِ خالق بے نیاز میں ہر دم سربسجود رہتے ہیں۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ ان چیزوں میں تو اپنی فطرت کے خلاف عمل کرنے کی قدرت و اہلیت ہی نہیں۔ وہ اپنی فطرت کے خلاف عمل کر نہیں سکتے۔ تو اس شبہہ کا جواب آگے آئے گا۔

پودوں کو دیکھو کس طرح تسبیح و تقدیس خالق میں مصروف ہیں اور ہر دم ہر لحظہ سجدۂ خالق میں سربسجود۔ اک گلاب کا پودا پھولتا ہے، خوشبو ہوا کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ تمام خلائق پر یکساں تقسیم کر دے اور سب کے مشام کو معطر کر دے۔ جس طرح وہ اپنے پرورش کرنے والے باغبان کو خوشبو پہونچاتا ہے اسی طرح اپنے پھول اور پتے توڑنے والے کے مشام کو بھی معطر کرتا ہے۔ وہ تو اپنے خالق کی فیاضی، جود و کرم، احسان و بخشش کا نقشہ عملی طور پر اہل عالم کو دکھلا رہا ہے۔ اس کے غنیٰ اور بے نیازی کا فوٹو کھینچ کر اس کی مخلوق کے سامنے پیش کر رہا ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ اللہ کے بندو! مجھے

دیکھو اور اپنے رب کی پاکیزگی بیان کرو۔ دیکھو اور غور سے دیکھو اور ہر طرف نظر دوڑاؤ۔ کیا تم کوئی عیب میری فطرت پر لگا سکتے ہو۔ لا واللّٰہ ہرگز نہیں۔ پس جب میں بے عیب ہوں تو میرا بلند و برتر رب تو ہر نقص و عیب سے بدرجۂ اتم منزہ ہوگا۔ تم اس کے کسی کام میں عیب نہیں نکال سکتے۔ یہ شانِ عبدیت ہے۔

غرضیکہ تمام مخلوق زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، پودے حتیٰ کہ وحوش و طیور سب کے سب تسبیح و تقدیسِ الٰہی میں مصروف اور بارگاہِ خالق میں سربسجود ہیں۔

ایک انسان ہی ایسا بدبخت ہے کہ اس کے اکثر ہم جنس فطرت کے خلاف عمل کر کے مستوجب عذاب ہوتے ہیں۔ خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارتے ہیں۔ اپنی فطرت کا علم حاصل کرنے کے بجائے محض خواہشات و جذبات کی تسکین میں مصروف رہتے ہیں۔ چونکہ بغیر علم اپنی خواہشات و جذبات کی تسکین کرنا چاہتے ہیں، ایسے اعمال و افعال کے نتیجہ میں تباہی و بربادی خرید لیتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص نے درخت پر ایک خوش رنگ پھل دیکھا، توڑنے کی خواہش ہوئی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ پتلی شاخ پر پیر رکھ دیا۔ شاخ ٹوٹی، گرا، ہاتھ یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ غلط خواہش اور جہالت کا نتیجہ ہوا۔

اسی طرح ہر خواہش اور جذبہ کی بغیر علم تسکین کرنے کا ہلاکت خیز انجام ہوتا ہے یہی باعث ہے کہ اس وقت تمام دنیا فساد سے بھر گئی ہے۔ اسی کی طرف مالک کا اشارہ ہے:۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ	خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا،
وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ	اس کے سبب جو لوگوں نے
أَيْدِي النَّاسِ ط	اپنے ہاتھوں سے کمایا۔

لوگوں نے قوم پرستی، وطن پرستی کے جذبات کی تسکین کرنی چاہی۔ اس کے نتیجہ میں تمام روئے زمین پر فساد پھیل گیا۔ اگر لوگ اپنی فطرتِ صحیحہ پر عمل کرتے، یہ وبال کیوں آتا اور فطرتِ صحیحہ کا اس وقت تک احساس نہیں ہوتا۔ جب تک جذبات کا جوش نہ مٹے۔ جس کے بعد ہی خود غرضی، تن پروری، نفس پرستی میں کمی ہو سکے گی اور اسی وقت دنیا میں امن قائم ہو سکے گا۔

سطورِ بالا میں اجرامِ فلکی، آفتاب، ماہتاب، ستارگان، سیارگان، پہاڑ، پودے درخت وغیرہ کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان کے متعلق معترض کہہ سکتا ہے، ان میں خواہشات وجذبات ہی نہیں اور نہ اختیار وارادہ ہے۔ پھر ان کی مثال سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

بے شک یہ صحیح ہے کہ ان میں خواہشات وجذبات نہیں۔ درست ہے ان میں اختیار وارادہ نہیں۔ وہ اپنی فطرت کے خلاف عمل کرنے کی طاقت وقوت ہی نہیں رکھتے۔ اسی لیے تو ان کے لیے کوئی فضیلت اور اجر بھی نہیں۔ مگر ان کی تمام کیفیات سے مالک کی شانِ ربوبیت ورحمانیت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس عالمِ مادّی میں اس کا فیض تمام مخلوق کے لیے یکساں ہے۔ جس طرح وہ مسلمین و مؤمنین کو نعیمِ مادی سے سرفراز فرماتا ہے۔ اسی طرح کفار ومشرکین کو بھی رزق پہونچاتا ہے اور اس حیاتِ دنیا میں اپنے فیوض کو نافرمانوں سے نہیں روکتا۔

ایسی تمام مخلوق جن میں خواہشات وجذبات تو ہیں مگر عقل نہیں، یعنے حیواناتِ مطلق تو وہ مکلف بھی نہیں۔ ان سے کوئی بازپرس بھی نہیں ہو سکتی، صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کو خواہشات وجذبات کے ساتھ عقل بھی دی گئی ہے۔

پس اگر انسان کی عقلِ فطری خواہشات وجذبات پر غالب آجائے تو اس کے

کام بھی بے غرض ہو جائیں۔ اسی وقت وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہوگا اور اسی منزل پر پہونچ کر فرشتوں سے بھی افضل ہو جائے گا۔ جب تک انسان خواہشات و جذبات کا بندہ بنا رہتا ہے۔ اس کو کسی مخلوق پر فضیلت نہیں ہوتی بلکہ تمام مخلوق سے ارذل ہی رہتا ہے جیسا کہ جناب رب العزت کا ارشاد ہے۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ — نہیں ہیں وہ مگر ڈھور ڈنگروں کی مثل بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

خدا کا پیارا محبوب دنیا سے خود غرضی مٹانے آیا اور محبت کا پیغام لایا۔ قرآن کریم نے ایمان کی علامت حب اللہ بتلائی جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — جو لوگ ایمان لائے اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہوتے ہیں۔

خدا کے حبیب نے تمام اہل عالم کو ایمان لانے کی دعوت دی۔ اگر ایمان لے آئیں اور حب اللہ پیدا ہو جائے تو اغراض بھی مٹ جائیں۔ اس لیے کہ محبت میں احساس غرض نہیں رہتا۔ جن کو اللہ کی محبت مل جاتی ہے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کے کام خلق اللہ کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں۔ جن میں ان کی اپنی غرض شامل نہیں ہوتی۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

محبت کی مثالیں بھی دیکھ لیں۔ جب انسان کسی فن میں ایسا کمال حاصل کر لیتا ہے کہ اس فن سے محبت ہو جاتی ہے تو بے نیازی کی شان ظاہر ہونے لگتی ہے۔

ایک طبیب جو ایسی منزل کمال پر پہونچ جاتا ہے کہ طبابت کی محبت میں اس پر محویت و استغراق طاری ہو جاتا ہے تو اکثر راہ چلتے آدمی کو بلا لیتا ہے اور دوا دے کر کہتا ہے، یہ دوا کھالو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اگر طبیب سے دریافت کیا جائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو کہے گا صرف اس لئے کہ اک بندۂ خدا ہلاکت سے بچ جائے

یہ شانِ عبدیت ہے۔ مگر چونکہ وہ زندگی کے صرف ایک شعبہ کے لیے فائدہ رساں ہے لہٰذا عبدیت ناقص ہے۔

ایک سائنس دان فطرت کا کوئی راز معلوم کرنے میں مصروف ہے۔ شب و روز اسی دھن میں غرق ہے۔ اپنے سر پیر کا ہوش نہیں۔ جب معلوم کر لیتا ہے، شائع کر دیتا ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے "اے انسانو! خدا کے بندو! یہ فطرت کا راز ہے اسے سنو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ" اس میں اس کی اپنی ذاتی کوئی غرض شامل نہیں ہوتی۔ یہ بھی شانِ عبدیت تو ہے مگر ناقص۔ اس لیے کہ خود اپنی فطرت سے ناواقف ہے اور اگر اس میں اس کی کسی غرض کا شمول بھی ہو جائے تو بندگیٔ نفس ہو جائے گا اور شرکِ خفی ہوگا۔

اسی طرح ہر انسان جو کسی فن میں منزلِ کمال پر فائز ہو جاتا ہے اور اس فن سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ محویت تامہ اور استغراقِ کامل پیدا ہو جائے تو وہ شانِ بے نیازی کا مظہر بن جاتا ہے۔

یہ تو بے نصیبی ہے کہ اس نے اپنی فطرت پر غور نہ کیا۔ اپنے نفس کو نجاستِ لاشعوری سے پاک نہ کیا جس سے خود اس کے نفس کو فائدہ پہونچتا اور مالک کی صفات کا مظہر بن جاتا۔ پھر اس کی مخلوق کو بے نیازی کا مظہر بننے کے طریقے سکھاتا اور منزلِ عبدیت میں داخل ہو کر اپنی آخرت بھی درست کر لیتا۔ مالک کے فیض و کرم کا دریا تو ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس کے کرم کی حوضیں تو ہر وقت چھلکتی ہیں۔ جو چاہے سیراب ہو۔

ہائے! انسان کیسا بدبخت ہے کہ اس کو پیاس کا احساس ہی نہیں۔ اگر احساس ہو جائے تو دوڑتا ہوا اس کے کرم کی چھلکتی حوضوں پر جائے اور آبِ رحمت سے سیراب ہو۔

اے غافل نادان! تیرا آقا تو ایسا غفور رحیم ہے۔ وہ تو تجھ پر ایسا مہربان ہے کہ بار بار فرماتا ہے۔ اے نادان انسان! تو گھبراتا کیوں ہے۔ کس لئے پریشان ہوتا ہے۔ میرا بندہ بنانا تیرا کام نہیں۔ تیرے لیے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ تو میرا غلام بن سکے۔ یہ تو میرا ہی کام ہے۔ میں کسی کو اپنا بندہ خود ہی بناتا ہوں۔ تیری طرف سے تو صرف رغبت درکار ہے۔ اگر تو مجھ سے طلب کرے گا۔ میری بارگاہ میں درخواست پیش کرے گا اور صدقِ دل سے چاہے گا تو میں خود تجھ کو اپنا بندہ بنالوں گا۔ کیا تجھے ہمارے وعدے کا یقین نہیں؟

وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ — وہ اپنی طرف ہدایت کرتا ہے اس کو جو رغبت کرے۔

وہ تو ایسا کریم ہے کہ اپنی صفات دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ارشاد فرماتا ہے:۔

عَبْدِیْ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْكَ مِثْلِیْ — میرے بندے میری اطاعت کر تو میں تجھے اپنے جیسا بنالوں گا۔

یعنی تجھے ایسی صفات دے دوں گا جیسی کہ تو میرے لئے سمجھتا ہے۔ جن کو تو میری صفات خیال کرتا ہے۔

ہاں بھائیو! جناب اصدق الصادقین کے وعدے پر اگر اعتبار ہے تو ہم کو چاہیے کہ اس کی طرف رغبت کریں۔ وہ تو ہم سے صرف طلبِ صدق چاہتا ہے۔ اگر ہم کو طلب ہوگی اور اس کا بندہ بننا چاہیں گے تو صرف ہماری چاہ پر ہی وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے گا۔ اس کی نصرت شاملِ حال ہوگی۔ وہ خود ہی ایسے حالات پیدا کردے گا کہ بندہ اس کی طرف کھنچا چلا جائے اور خود اس کو کوئی تکلیف کرنی نہ پڑے۔

اے نادان انسان! تو اس کا بندہ بننے کی خواہش کر تو سہی۔ پھر دیکھ وہ تجھے

اپنی طرف بلاتا ہے کہ نہیں ۔ وہ تجھے اپنا بندہ بناتا ہے کہ نہیں ۔ اگر تو اس کا عبد بن گیا تو فرشتے تیرے خادم بن جائیں گے اور خدائی سلطنت میں خلقی چیزیں ہیں سب تیری مطیع و فرمانبردار ہو جائیں گی ۔ ہم میں سے بہت سوں نے یہ شعر سنا ہوگا ۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ ۔ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ !

(تو اپنے پروردگار کے حکم سے گردن نہ پھیر یعنی نافرمانی نہ کر تاکہ تیرے حکم کی بھی کوئی نافرمانی نہ کرے ۔)

اپنے بندگانِ خاص کے لیے رب نے فرمایا ہے :۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ط ۔ اللہ نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں ۔

قربان اس کی رحمت کے ۔

جناب ارحم الراحمین اپنے بندگانِ خاص کے صدقے سے ہم بدنصیبوں پر بھی اپنی رحمت نازل فرمائے اور توفیقِ ہدایت عطا فرمائے تاکہ ہم بھی نفس و شیطان کی بندگی سے نکل کر اس کے بندے بن سکیں اور اس کی عبادت بجا لا سکیں ۔

آمین ثم آمین ۔

اب اس مضمون کا لب لباب بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین رسالہ مستفید ہو سکیں اور نکات ذہن نشین ہو جائیں ۔

(۱)

خدا کی عبادت کا معمولی مفہوم یہ ہے کہ جو ملک و املاک ، زر و مال ، اولاد وغیرہ اس نے ہمیں عطا فرمائے ہیں ، سب کو اس کی ملک سمجھتے ہوئے اس کی مرضی کے مطابق

ان میں تصرف کریں۔ ان کی نگرانی و حفاظت فرض جانیں۔ مالک سے طلب کرتے رہیں کہ وہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے کہ اس میں ہماری اغراض و خواہشات شامل ہو جائیں۔ وہ ہمیں اسراف سے محفوظ رکھے اور توفیق عطا فرمائے کہ ہم ذرا سی چیز کو بھی فضول ضائع نہ ہونے دیں۔ کسی چیز کی طرف سے لاپرواہی نہ کریں۔ ذہن میں کسی وقت یہ خیال نہ آئے کہ کوئی شے ہماری مالک ہے بلکہ ہمیں یہ یقین عطا فرما دے کہ جو کچھ ہے سو اس کا اور اس طرح:۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ — جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کا ہے۔

پر ایمان لا سکیں اور ہمیں اس امر کی توفیق عطا فرمائے کہ ہمیں یقین حاصل ہو جائے کہ ہمارا نفس، جسم، اعضاء و جوارح سب اسی کے ہیں جن کی تربیت و اصلاح، اس کے قوائے باطنی کو ترقی دینا بھی اسی کی بندگی ہے۔ اس لیے کہ نفس کی غفلت کم ہوئے بغیر تو اس کی بندگی ہو ہی نہیں سکتی اور لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ مالک کے وجود کا یقین قلبی حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مالک کو پکارتے رہیں، اس سے مدد مانگتے رہیں کہ وہ ہمیں اپنے راستہ پہ چلائے۔ نماز و روزے کو صحیح طور پر توجہ قلبی سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ نفس کی اصلاح ہو سکے اور عبادتِ حقیقی کے اہل بن سکیں کہ دنیا کے سب کام ہم اس کا فریضہ سمجھ کر کرنے لگیں اور اس جلیل القدر، عظیم الشان حکومت کے بندے بن سکیں

(۲۱)

منزل عبدیت میں قدم رکھنے کے بعد تمام عزیز و اقارب اور پڑوسیوں کی خبرگیری کرنے کا اہل ہو جائے گا۔ پڑوس کی تفصیل مولائے کائنات نے یہ بیان فرمائی ہے

کہ :-

"اپنے مکانِ مسکونہ چالیس چالیس گھر چاروں طرف تمہارا پڑوس ہے"۔

اور پڑوسیوں کے لیے فرمایا ہے کہ :-

"اگر کوئی شخص رات کو شکم سیر ہو کر سو رہا ہو اور اس کے پڑوس میں کوئی بندۂ خدا بھوک سے کروٹیں بدل رہا ہو تو یہ سیر ہو کر سونے والا خدا پر ایمان ہی نہیں لایا"۔

سبحان اللہ! اگر ہم خدا و رسول پر ایمان لے آئیں اور حبّ اللہ سے قلوب منور ہو جائیں تو نفوس میں اتنی اہلیت پیدا ہو جائے کہ اپنے پڑوس کے اتنے علاقہ میں جس کی مولائے امم نے تفصیل بیان فرمائی ہے بندگانِ خدا کی بلا قیدِ مذہب و ملت، بلا امتیازِ رنگ و نسل خبر گیری کر سکیں۔ پھر تو کمیونزم، سوشلزم وغیرہ وغیرہ تمام ان نظاموں میں سے جو آئے دن غافل انسانوں کی رائے اور قیاس سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں کسی نظام کی ضرورت نہ رہے گی اور صرف اسلام ہی دنیا میں امن قائم کرنے کو کافی ہوگا۔

(۳)

منزلِ عبادت میں ترقی کے ساتھ ساتھ دائرۂ عبادت بھی وسیع تر ہوتا جائے گا اور انسانوں کے علاوہ ربّ العزت کا بندہ حیوانات و نباتات کی بھی خبر گیری کرنے لگے گا۔ اس لئے کہ غلام تو مالک کی املاک میں ہر چیز کی نگرانی اور پاسبانی کرتا ہے۔ اگر ایک جانور پیاسا ہوگا اور پانی صرف اتنا ہی ہو کہ وضو کے لیے کفایت کر سکے تو وہ بندہ جانور کو سیراب کر دے گا اور نماز تیمم سے ادا کرے گا۔

جنابِ ربّ العزت ہر کافر و مشرک کو بھی اسی طرح نعماتِ دنیاوی سے

سرفراز فرماتا ہے جس طرح ایک مسلم دشمن کو۔ لہذا اس کا بندہ بھی دوست و دشمن سب کے ساتھ حسن سلوک کرے گا۔ دشمنوں کو ان کی مصیبت کے وقت پوشیدہ طور پر مدد پہونچائے گا تاکہ ان کو شرمندگی نہ ہو یا وہ اس کی نصرت قبول کرنے سے انکار نہ کریں۔

(۴)

مذکورہ بالا کیفیات گو کہ عبدیت کی بہت خاص منازل ہیں مگر ان سے بھی بلند تر ہو سکتی ہیں۔ جس بندے کو عبدیت میں منزل اعلیٰ حاصل ہو جائے، اس کی عبادات کی کیفیات ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہیں۔ نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جتنی منزل عبدیت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ اتنی ہی عبادت میں بھی ترقی ہوتی جائے گی اور عبد کو معبود کا تقرب حاصل ہوتا جائے گا۔ اس منزل کے لئے حدیث قدسی میں رب العزت کا ارشاد ہے:۔

"جب میرا بندہ نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں خود اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ میں خود اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ میں خود اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن کو وہ پھیلاتا ہے" (وغیرہ تا آخر حدیث)

اب دیکھنا یہ ہے کہ نفل کس کو کہتے ہیں۔ نفل کے معنے ہیں "زائد"۔ مثلاً پانچ وقت کی نمازیں واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو زائد نمازیں پڑھیں وہ نفل ہیں۔ اپنے اہل و عیال کی پرورش فرض ہے۔ اگر دوسروں کے اہل و عیال کی بھی خبر رکھے یہ نفل ہے۔ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا لازم ہے۔ پڑوسیوں میں سے اہلِ حاجت

کے بچوں کو پڑھائے۔ یہ نفل ہے۔ غرضیکہ خدمت خلق اللہ۔ اللہ کا ذکر بہ کثرت کرتے رہنا مالک کی محبت کے سبب اس کی مخلوق سے محبت کرنا یہی تقرب کے ذرائع ہیں۔

(۵)

اب غور کریں کہ اس بندے کی عبادت کیا ہو گی جو پیدائش سے ہی کمالِ عبدیت پر فائز ہو۔ جو عبدِ کامل ہی پیدا ہوا ہو۔ وہی تو اس کا نور، اس کا امر، اس کا ارادہ، اس کا کلمہ، اس کا نائبِ حقیقی ہو۔ وہ ہی خلیفۃ اللہ ہے، وہی وجہ اللہ ہے، وہی عین اللہ ہے، وہی اذن اللہ ہے۔ وہی لسان اللہ ہے۔ وہی ید اللہ ہے اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ و حجاب ہے۔ اس کی مشیت خدا کی مشیت، اور خدا کی مشیت اس کی مشیت۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ — اور تم تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہ جو خدا چاہے۔

کا مصداق۔ اس کا کام خدا کا کام۔ وہ دیکھے تو خدا نے دیکھا۔ وہ سنے تو خدا نے سنا۔ وہ بیعت لے تو خدا نے بیعت لی۔ وہ سنگریزے پھینکے تو خدا نے پھینکے۔ وہ کچھ کہے تو خدا نے کہا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى (سورہ نجم پ ۲۷) — اور وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہی نہیں وہ تو بس ہماری وحی ہی ہوتی ہے جو وحی کی جاتی ہے

ایسے ہی بندے کو وہ معبودِ حقیقی اپنا عبد کہتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى — پاک و پاکیزہ ہے وہ (یعنی وہ

بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ	ہر نقص وعیب سے منزہ ہے!
الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ	جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات
الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا	مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس
حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا	کے گرد و نواح کو ہم نے برکت
إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ	دی ہے تاکہ اسے اپنی نشانیاں
	دکھلائے تحقیق کہ وہ بڑا سننے والا
(سورہ بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱)	دیکھنے والا ہے)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى حَبِيْبِكَ وَمُنْزِلِ وَحْيِكَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ
مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَاَفْضَلِ مَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَ
تَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ رسالہ ہذا کی بنیاد رسالہ "پیغام رسول" ہے جو بندہ حقیر نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے باب دوم میں نیچری اور دہریہ حضرات اور مشککین و معاندین اسلام کے بتیس سوال درج تھے جن کے منجملہ صرف دو سوالات کے جواب تو سوالات کے بعد ہی درج تھے باقی جو اٹھارہ سوالات تھے ان کا جواب درج نہیں کیا تھا بلکہ خیال تھا کہ علیحدہ علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیے جائیں۔

اب ناظرین کے مطالعہ کے لیے اس باب کی پوری نقل ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

اس میں ہر سوال کے بعد اس کا جواب بھی درج کر دیا گیا ہے اور وہ حسب ذیل ہے۔

رسالہ پیغام رسول کا باب دوم

بغاوت از اسلام

ہر شخص کو اپنے مذہب سے محبت ہوتی ہے اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس قدر بھی اس کی تبلیغ و اشاعت ہو سکے اس میں کوشش کرے۔ مسلمان غریب ہزاروں روپیہ تبلیغی انجمنوں کو دیتے ہیں۔ علمائے کرام تبلیغ و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں اور دور و دراز ممالک میں غیر اقوام کو دعوتِ اسلام دیتے ہیں۔ مگر افسوس اس امر کا ہے کہ اپنے گھر کی خبر نہیں لیتے۔ پہلے اپنے گھر کی اصلاح ضروری ہے۔ باہر کی خبر بعد کو لینی چاہیے۔

علوم مغربی کی تحصیل سے مسلمانوں میں آزاد خیالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ جب ایک تعلیم یافتہ مسلمان کے سامنے کوئی غیر شخص عقائد و اعمال اسلام پر اعتراض کرتا ہے یا خود اس کے ذہن میں کوئی ایراد و شبہ پیدا ہوتا ہے تو اپنے اعزہ کے سامنے پیش کر کے جواب کا طالب ہوتا ہے۔ جب وہ جواب نہیں دے سکتے تو مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مؤدبانہ عرض کرتا ہے جس کا جواب یہ ملتا ہے کہ ایسی باتیں کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ خبردار! کافر و مرتد کی سزا جہنم ہے۔

کیا ایسے جواب سے اس کی تشفی ہو سکتی ہے؟ آخر وہ غریب اسلام سے بدظن ہو کر عقائد مذہبی کا مضحکہ اڑانے لگتا ہے۔ حقیر مصنف کو ایسے اکثر حضرات سے پالا پڑا۔ بہت سے سوالات ان حضرات نے دریافت کیے اور ان پر بحثیں کیں۔ ان

میں سے چند ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

سوال ۱:

”مذہب کا مقصد تمدن ہے اور دنیا اب اتنی ترقی کر گئی ہے کہ انسان اپنے فرائض اور امورِ تمدن کو سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اب مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ وہ تو صرف جہال کے واسطے ہے۔“

جواب:

عرض کیا ماشاءاللہ آپ تو تعلیم یافتہ ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک مشین عمل کیمیاوی کے لیے امریکہ میں ایجاد ہو اور یورپ بھیجی جائے تو کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل انجنیر تمام یورپ میں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اس مشین کو بغیر بنانے والے کی ہدایات معلوم کیے استعمال کر سکے؟ اسی لئے بنانے والے کی کتابِ ہدایت (Makers' Instruction Book) ہر مشین کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس پر فرمانے لگے کہ ”نہیں بغیر کتاب ہدایت دیکھے اس کو کوئی بھی استعمال نہیں کر سکتا۔“ بندہ نے عرض کی کہ اگر ناواقف آدمی جو انجینئرنگ میں مہارت نہ رکھتا ہو۔ ممکن ہے اپنی جہالت کے سبب اس مشین کو چلانا اور استعمال کرنا چاہے مگر ایک ماہر فن انجنیرنگ تو بغیر بنانے والے کی کتاب ہدایت دیکھے، اس مشین کو ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔

انسان خود ایسی حیرت انگیز مشین ہے جس میں تمام دنیا کی عجائبات بھری ہوئی ہیں۔ جو شخص اس کی قدر و منزلت سے واقف ہو گا وہ تو اس کو بے خوف ہو کر اس وقت تک استعمال نہ کرے گا جب تک اس کے بنانے والے کی ہدایات معلوم

نہ کرے۔ البتہ جاہل نااہل اس کو اپنی خواہشات وجذبات کے مطابق استعمال کر کے ضرور خراب کرے گا۔ اس لئے مذہب کی انسان کو سخت ضرورت ہے۔

سوال ۲

"خدا ارحم الراحمین ہے اور وہ خود فرماتا ہے کہ" اللہ تعالیٰ تمام عالمین سے بے نیاز ہے۔ تمام جہانوں میں اگر کوئی بھی اس کو نہ مانے تو خدا کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا اور تمام کائنات کا ہر فرد اس کی اطاعت میں ہر لمحہ مصروف رہے تو اس کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا" پھر خدا کو کیا ضرورت ہے کہ انسان کو اس کی نافرمانیوں کی سزا دے اور سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کرے"۔

جواب:

جواب میں عرض کیا کہ جس قدر قوانینِ مادی اور اصولِ فطرت تمام عالم میں جاری ہیں۔ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے، جل جاتا ہے۔ ایک شخص عمیق پانی میں کود جاتا ہے، غرق ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کلہاڑی اپنے پیر پر مارتا ہے، پیر کٹ جاتا ہے اور کسی کو بھی خدائے ارحم الراحمین اپنے بنائے ہوئے مادّی قوانین کی خلاف ورزی پر سزا سے نہیں بچاتا۔ تو کیسے احمق ہیں وہ لوگ جو عالمِ روحانی سے تعلق رکھنے والے قوانینِ فطری کی خلاف ورزی پر سزا کے قائل نہ ہوں۔

برایں عقل و دانش بباید گریست

سوال ۳ متعلقِ وضو!

یہ سوال اور اس کا جواب بہ تفصیل فلسفۂ وضو میں گذر چکا۔ دیکھیں صـ۸۱ تا صـ۸۹

سوال ۴ متعلقِ قربانی!

یہ سوال اور اس کا جواب بہ تفصیل قربانی کے بیان میں گذر چکا۔ دیکھیں صـ۱ تا صـ۱۸

سوال ۵ متعلقِ نماز!

یہ سوال اور اس کا جواب نماز اسلامی میں گذر چکا۔ دیکھیں صـ۴۵ تا صـ۶۰

سوال ۶ متعلقِ نمازِ جماعت!

یہ سوال اور اس کا جواب نماز جماعت کے بیان میں گذر چکا۔ دیکھیں صـ۶۱ تا صـ۶۲

سوال ۷ متعلقِ روزہ!

یہ سوال اور اس کا مفصل جواب اسلامی روزہ کے بیان میں گذر چکا۔ صـ۶۲ تا صـ۸۱

سوال ۸ متعلقِ عبادت!

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ یہ سوال اور اس کا تفصیلی جواب عبادت کے بیان میں گذر چکا۔ دیکھیں صـ۹۰ تا صـ۱۱۳

سوال ۹

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت میں ایک ترازو لا کر کھڑی کی جائے گی جس میں ایک پلڑے میں نیکیاں اور دوسرے میں بدیاں رکھ کر وزن کی جائیں گی، اول تو اعمال وزن کرنے کی چیز نہیں۔ دوسرے، کیا خدا ایسا مجبور ہے کہ بغیر ترازو کے وزن نہیں معلوم کر سکتا۔ یہ اللہ پاک کا دربار ہے یا بنیے کی دوکان ؟"

جواب :

کلام اللہ میں ہے :-

اَلْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

آج تولنا حق ہے پس جن کی ترازویں بھاری ہوں گی۔ بس وہی چھٹکارا پانے والے ہیں۔ (پ ۸ - ع ۸)

اور دوسرے مقام پر ہے :-

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝

پس جس کی ترازویں بھاری ہوں وہ حیات رضا میں ہوگا۔ (قارعہ پ ۳۰)

یہ آیات متشابہات ہیں۔ ان میں الفاظ کے ظاہری معنے مراد نہیں ہو سکتے۔ جب ایک شخص کہتا ہے "اس کی بیہودہ باتوں سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی"۔ تو کیا مادی آگ کا شعلہ مراد ہوتا ہے؟ یہ تو استعارہ ہے۔

اب پہلے وزن ہی کو لیجیے۔ آپ بولتے ہیں، "پہلے تولو بعد کو بولو"۔ تو کیا یہاں ڈنڈی ترازو سے تولنا مراد ہے۔ نہیں بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی برائی بھلائی کا موازنہ کر لو۔ اس پر غور و فکر کر لو۔ اسی طرح الوزن سے بھی موازنہ مراد ہے : کہ دو پلڑے کی جسمانی ترازو اور باٹوں سے تولنا۔

اب رہا سوال "موازین" کا، تو ہر اس چیز کو جس کے ذریعہ سے موازنہ کیا جائے "میزان" کہتے ہیں۔ مثلاً حرارت کے ناپنے کا آلہ تھرمامیٹر ہے، یہ حرارت کی میزان ہے تو بندوں کے اعمال کا موازنہ صالحین ومتقین سے ہونا چاہیئے اور جن کے اعمال سے موازنہ کیا جائے وہ ہی اعمال کی میزانیں ہیں مگر ان آیات میں عام صالحین متقین وصدیقین کا ذکر نہیں بلکہ صاحبانِ ایقانِ کامل کا ذکر ہے جو ثقل ہیں اور بہت بھاری ہیں۔

آپ اپنی زبان میں ایسے شخص کو جو اپنے راز وعزائم کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان پر صبر کیے رہتا ہے یہی کہتے ہیں وہ بہت بھاری بھرکم آدمی ہے اور اس کی بات میں بہت وزن ہے۔ پس یہاں بھی ثقل سے مراد انسانِ کامل، انبیاء واوصیا علیہم السلام ہیں۔

لہٰذا آیاتِ مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں انبیاء واوصیا علیہم السلام کو اعمال کا نمونہ سمجھ کر ان کے اعمال کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی وہی عذاب سے چھٹکارا پانے والے ہوں گے۔

اس کی مزید تفصیل کتاب "انوار الایقان" کے باب دوم میں بیان کی گئی ہے شائقین اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

سوال نا

" بنیا جب حساب کرتا ہے تو دوبارہ اسے جانچنا ضروری سمجھتا ہے اس لیے کہ کہیں غلطی نہ رہ گئی ہو۔ اس کو اپنے نفس پر غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ تو کیا مسلمانوں کا خدا بھی ایسا ہی ہے جس کو اپنے حساب کتاب پر آپ ہی اعتبار نہیں کہ حساب کتاب کے بعد بھی دوبارہ جانچ کرنے

کے لیے جہنم کے اوپر ایک پل بنا رکھا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے تاکہ اعمال تول لینے اور حساب کتاب کر لینے کے بعد بھی جو شک رہ جائے اس کو دور کرنے کے لیے اس پر لوگوں کو دوڑایا جائے۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز عقیدہ ہے۔

اچھا اگر آدمی اس پر دوڑا بھی جائے تو اس کے تو دو پیر ہیں مگر مسلمان حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ قربانی کے چار پیر والے دنبوں اور بکروں پر سوار ہو کر دوڑیں گے۔ بھلا جب آدمی کے پیر کٹ جائیں گے تو دنبے کیسے صحیح وسلامت رہ سکتے ہیں؟ اگر دنبہ اور بکرا صراط پر سے گذر سکتا ہے اور انسان نہیں گذر سکتا تو بکرا انسان سے افضل ٹھہرا۔ کیا اسلام حیوان کو انسان پر فضیلت دیتا ہے؟

دوسرا امر اس میں مضحکہ خیز یہ ہے کہ جس شخص نے پچاس دنبے قربان کیے ہوں، وہ سارے دنبوں کو نیچے اوپر چڑھا کر سب سے اوپر والے پر سوار ہو کر پلصراط عبور کرے گا یا آگے پیچھے قطار بنا کر؟ یہ کیسے بیہودہ عقائد ہیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نٹوں کی شاگردی اختیار کریں تاکہ وہ رسّی پہ دوڑنا سیکھ لیں پھر ریشم کی باریک ڈوری پہ دوڑنے کی مشق کریں تاکہ قیامت میں پلصراط پر جب تماشا دکھانا پڑے تو اس میں کامیاب رہیں۔"

جواب:

ایسی تمام آیات واحادیث جن میں غیر محسوس عالمِ غیب کا ذکر ہے متشابہ ہیں ان میں لفظی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ یہ تمام کیفیاتِ نفس کا بیان ہے۔

نفسِ انسان کے متعلق اب تمام دنیا میں یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ نفسِ انسان خارجی دنیا کے لیے نیم شعوری حالت میں ہے مگر اپنے باطن کے لیے مطلقاً لاشعوری ہے۔ لہذا اس سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں وہ محض خارجی کا ردِعمل ہوتے ہیں۔ اس کو یہ تمیز ہی نہیں ہوتی کہ یہ کام ضروری اور مفید ہے یا غیر ضروری اور مضر۔

پس جو شخص ان احکامِ قرآنی پہ عمل کرے گا جن سے شعورِ باطن پیدا ہوتا ہے اور غفلت نفس کم ہوتی ہے تو اس کو فریضۂ فطری کا احساس ہونے لگے گا۔ ہر حرکت و سکون پہ اس کو احساس ہو جائے گا کہ یہ ضروری اور فریضۂ فطری ہے یا نہیں۔ اسی وقت اس کو صراط نظر آئے گی پھر جب نظر آ جائے تو اس پہ چلنے کی خواہش بھی پیدا ہوگی اور صدقِ دل سے دعا کرے گا:۔

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ — اے رب مجھے صراط پہ چلا یا اپنے سیدھے راستہ پہ چلا۔

سورۂ یٰسین میں جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ نے صراطِ مستقیم کی تعریف بیان فرما دی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (پ ۲۳ - ع ۳)

اے بنی آدم کیا ہم نے تم سے عہد نہ لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ صرف میری ہی عبادت کرنا ہی سیدھا راستہ (صراط) ہے۔

عبادت کے بیان میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ دنیا کے تمام کام اگر رضائے خالق کے لیے ہوں، خدا کی خالص بندگی ہیں، اگر نفس کی خواہش سے ہوں تو بندگی

نفس ہوں گے۔ عبادت اور شرکِ خفی کے درمیان حدِ فاصل ہے ہی نہیں۔ سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ جس کے لئے یہی تمثیل مناسب ہے کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔

جب تک نفس اپنے باطن کے لیے مطلقاً لاشعور رہتا ہے اس کا ہر عمل پیدا وہی خواہشات وجذبات ہی میں ہوتا ہے۔ جب کچھ شعورِ باطن پیدا ہوتا ہے اور احساس فریضۂ فطری ہو جاتا ہے تو وہ بے فائدہ اور عبث کاموں سے بچنے لگتا ہے اور اس کے اکثر افعال ادائے فریضۂ فطری کے لیے ہونے لگتے ہیں اور یہ ہی معبودِ حقیقی کی عبادت ہے۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ راستہ واقعی بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔

ایک شخص خلوص سے کارِ خیر میں مصروف ہوتا ہے۔ درمیان میں ذرا سا خیال آ جائے کہ لوگ دیکھ لیں، میں کارِ خیر میں مصروف ہوں۔ خیال آتے ہی وہ عمل ریا میں داخل ہو گیا۔ یہ بال سے زیادہ باریک راستہ صراط ہے۔

کتابِ "انوار الایقان" بابِ دوم میں اس کی مفصل شرح بیان کی گئی ہے۔ شائقین وہاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

سوال ۱۱

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت ہمیشہ رہنے والی ہے اور وہ داخلِ جنت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جس کی دلیل قرآن سے لاتے ہیں۔ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ط مگر جو چیز ہمیشہ رہنے والی ہوتی ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جس میں تغیر ہوگا اس کا ابدالآباد رہنا ممکن نہیں وہ تو ایک روز ضرور فنا ہو جائے گی۔

پس شرابِ حوض کوثر حوض سے جام میں آئی۔ جام سے اہل جنت کے منہ میں۔ حلق میں اور حلق سے پیٹ میں جائے گی اور یہ تغیر ہے۔ پھر وہ ابدی کیسے ہو سکتی ہے؟ حالانکہ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں میں تغیر ہونا ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایک ایک مرد کو ستر ستر ہزار حوریں ملیں گی مگر عورتوں کے متعلق بالکل خاموشی نظر آتی ہے کہ وہاں ایک ایک عورت کو کتنے کتنے ہزار سنڈے مستنڈے غلمان ملیں گے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مردوں کو تو ہزاروں حوریں مل جائیں اور عورتیں غریب محروم رہیں۔

مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ حورانِ جنت سے ہم بستر بھی ہوں گے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تغیر واقع ہونا ضروری ہے۔ اگر تغیر نہ ہوا تو ابدُ الآباد صحبت میں ہی مصروف رہیں گے۔ اگر یہ درست ہے تو هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے) میں ھَا کی ضمیر یعنی "اس میں" کی ضمیر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے حور مراد ہے یا کچھ اور......؟"

جواب:

جناب باری تعالیٰ عز اسمہٗ سورۂ محمدؐ کے دوسرے رکوع میں ارشاد فرماتا ہے:۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ	اس جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے ایسی ہے کہ
....	اس میں پانی کی نہریں اور دودھ
....	کی، شہد کی اور شراب کی نہریں
.... (پ۲۶)	اور بے شمار پھل وغیرہ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مادی تمثیلیں ہیں حقیقت نہیں۔ لہٰذا ایسی تمام آیات و احادیث متشابہات ہیں، محکمات نہیں۔ ان کو بے سمجھے والے گمراہ ہوتے ہیں۔

اب اس کا دوسرا ثبوت بھی قرآنِ حکیم ہی سے دیکھ لیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۱پ ۔ ع ۱۵)

پس کوئی نفس نہیں جان سکے گا جو کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے ان کے لیے خنکیٔ چشم کا سامان اس کے بدلے ہیں جو کچھ وہ عمل کرتے تھے۔

اور نعیم جنت کے لیے حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہوں گی کہ:

لَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ فِیْ قَلْبِ بَشَرٍ

کسی آنکھ نے دیکھا نہ ہو، کسی کان نے سنا نہ ہو اور ان کا تصور کسی شخص کے دل میں نہ آیا ہو۔

اس آیۂ وافی ہدایہ سے اور حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ جو کچھ بھی انسان کے خیال و قیاس اور وہم و گمان میں آ سکے، جو کچھ وہ سمجھ سکے وہ جنت نہیں۔

لہٰذا واضح ہو گیا کہ جو کچھ جنت اور اس کی نعمتوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے، قرآن میں یا احادیث میں وہ تمام کی تمام تمثیلیں ہیں۔ حقیقت نہیں۔ وہ نعمتیں مادی اور محسوسات سے نہیں۔ پس اگر کوئی شخص جنت اور اس کی نعمتوں کا جن کا ذکر قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے اپنے قیاس سے ظاہری معنی میں سمجھ کر اعتراض کرے تو اس کی نادانی اور جہالت ہے۔

جنت اور نعیم جنت کی پوری تفصیل کتاب "انوار الایقان" کے باب سوم میں بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ شائقین اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

سوال ۱۲

"ہر سزا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرم دوبارہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرے اگر کسی شخص کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ کوئی جرم کر لیتا ہے وہ دوبارہ بھی اس کا مرتکب ہو سکتا ہے لہذا اس کو اعادہ جرم کا موقع نہ مل سکے۔ اور دوسرا مقصد عوام کو نمائش کرنا ہوتا ہے کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

اب غور کیجیے کہ کثیر التعداد مخلوق کو ابد الآباد جہنم کے اندر عذاب دردناک میں مبتلا رکھنے سے اللہ پاک کا کیا مقصد ہے؟ نہ وہ لوگ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور نہ اہل دنیا اس کو دیکھ سکتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو اس سے عبرت حاصل ہو۔ لہذا یہ ہمیشہ ہمیشہ کی سزا ایک فعل عبث ہے جس کا خدا سے صادر ہونا محال ہے۔ یہ کیا لغو اور فضول عقائد بنا رکھے ہیں۔"

جواب:

جس طرح وہ تمام آیات و احادیث جن میں جنت اور اس کی نعمات کا ذکر کیا گیا ہے تمام کی تمام متشابہ ہیں۔ اسی طرح وہ آیات و احادیث بھی جن میں جہنم اور اس کے عذاب کا تذکرہ ہے متشابہ ہی ہیں۔ ان کے الفاظ کے ظاہر معنی مراد لینا باعثِ گمراہی ہے۔ اب رہی ابد الآباد کی سزا۔ تو اس کے لیے اس پر غور کریں کہ تمام کائنات کا نظام

اصولِ فطرت پر قائم ہے اور اصولِ فطرت کی خلاف ورزی کی سزا ہر بچے، جوان، بوڑھے کو دائمی ہی ملتی ہے۔

ایک شخص درخت پر چڑھتا ہے۔ ایک پتلی شاخ پر پیر رکھ دیتا ہے۔ شاخ ٹوٹتی ہے گرتا ہے، ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اب کیا کبھی بھی اس کو سالم ٹانگ میسر آسکتی ہے؟ کیا ایک سکنڈ کی غلطی کی سزا دائمی نہیں ہوتی؟ جب مادی قوانین فطرت کی خلاف ورزی کی سزا دائمی ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روحانی قوانینِ فطری کی خلاف ورزی کی سزا دائمی نہ ہو۔

ایسے اعتراض خدا کو آدمی کی مثل کوئی ہستی سمجھ کر کیے جاتے ہیں لہذا لغو اور فضول ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں جو کچھ اصولِ فطرت کے تحت عمل و ردعمل ہو رہا ہے اور ہوتا رہتا ہے وہ ہی خدا کے کام کہلاتے ہیں اور اسی کے کام ہیں۔

سوال ۱۳

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو کیا خدا بولتا ہے؟ یا خدا کی زبان عربی ہے اور کسی زبان میں بات کرنا نہیں جانتا؟ اگر اللہ تعالیٰ صرف عربی ہی جانتا ہے تو کیا اور کتابیں جو پہلے نازل ہوئیں جن پہ مسلمان بھی عقیدہ رکھتے ہیں، سب عربی ہی میں تھیں؟ اور اگر اللہ پاک ساری زبانیں جانتا ہے تو صرف ایک ہی زبان میں آخری کتاب کیوں نازل کی؟

دوسرا امر یہ کہ آیاتِ قرآنیہ مسلمانوں کو رسول کی زبانی پہونچیں اللہ تعالیٰ کی آواز تو کسی کے کان میں نہ آئی، رسول کے منہ سے آیات کی آواز نکلی۔ رسول اپنی مادری زبان عربی میں بولے تب لوگوں نے سنا تو یہ

کلام تو رسول ہی کا ہوا۔ اللہ تعالےٰ کا کلام کیسے ہو گیا؟ (سائل ہندو ہے)

جواب:

اس سوال کے کئی جز ہیں:

ا:۔ اگر قرآن خدا کا کلام ہے تو کیا خدا بولتا ہے؟ اس کے جواب کے لیے رسالہ ہذا کا ص ۱۸ ملاحظہ ہو۔

ب:۔ قرآن عربی ہی میں کیوں نازل ہوا؟ کیا خدا کی زبان عربی ہے؟ کیا پہلی کتب بھی عربی میں نازل ہوئی تھیں؟ اس کا جواب رسالہ ہذا کے ص ۲۰ پر ہے۔

ج:۔ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ملا۔ پھر وہ خدا کا کلام کیسے ہو گیا؟ اس کا جواب رسالہ ہذا کے ص ۱۸ پر ہے۔

د:۔ آخری کتاب صرف ایک ہی زبان یعنی عربی ہی میں کیوں نازل ہوئی؟ اس کا جواب رسالہ ہذا کے ص ۲۲ تا ص ۲۴ پر ہے۔

سوال ۱۴

"قرآن کہتا ہے سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (سات آسمان تہ بتہہ) یہ سات آسمان کہاں ہیں؟ تحقیقِ جدید سے واضح ہو گیا ہے کہ وہ سات آسمانوں کا پرانا عقیدہ بالکل باطل ہے۔ پھر مسلمانوں کا خدا یہ کونسے سات آسمان پیدا کرنے کا ذکر کر رہا ہے۔

جواب:

اس کا جواب رسالہ ہذا کے ص پر دیکھیں۔

سوال ۱۵

"ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ط (پھر چڑھ گیا عرش پر یا متوجہ ہوا عرش کی طرف) یہ عرش کہاں ہے؟ وہ دقیانوسی عقائد کہ سات آسمانوں کے اوپر آٹھواں عرش ہے اب بالکل باطل ہو گئے۔"

جواب:

عرش کے بہت سے معنی ہیں جن کے منجملہ صرف دو ہی دیکھ لیں۔

۱ "تمام کائنات کا مجموعہ" - اس لحاظ سے یہ مراد ہوئی کہ تمام کائنات پر غالب ہوا اس کے علم نے سب کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

۲ "قلب مؤمن"۔ حدیث سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے:-

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰهِ۔ مومن کا دل اللہ کا عرش ہے۔

اس معنی سے یہ مفہوم ہوا کہ جب مومن پیدا ہوئے تو اس کے نور کی منزل قلبِ مومن ہوا۔ دیگر معانی کی اب ضرورت نہیں رہی۔ سائل کے لیے اتنا جواب ہی کافی ہے۔

سوال ۱۶

"ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ (پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف) یعنی زمین کی چیزیں بنا کر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے زمین بنائی۔ اس سے فارغ ہونے پر آسمان بنانے کی طرف توجہ کی۔ ایسا ہی انسان بھی کرتا ہے کہ ایک کام ختم کر کے دوسرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پھر اللہ پاک بھی

انسان کی مثل ہوا"۔

جواب:

یہ اعتراض اور اس کی مثل اسی شخص کے ذہن میں آتے ہیں جو ان آیات کو محکم سمجھتا ہے حالانکہ یہ متشابہات ہیں۔ خدا کو آدمی کی مثل جاننے والا ہی ایسے اعتراض کر سکتا ہے۔ خدا کے سارے کام اصولِ فطرت کے ماتحت ہوتے ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ وہ تو فرماتا ہے:

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (سورہ الاعلیٰ) (پ ۳۰)

اس نے تو تمام کائنات کے لیے قوانین بنا دئے اور ہر شئے کو اسی کے مطابق ہدایت کر دی۔

فطرت کے قوانین کے تحت سارے کام بتدریج ہی ہوتے ہیں مثلاً پہلے ابر آتا ہے پھر غلیظ ہوتا ہے پھر بارش ہوتی ہے۔ پس جتنے کام کائنات میں اصولِ فطرت کے تحت ہو رہے ہیں۔ وہی خدا کے کام ہیں۔ خدا کے کام کو انسانی افعال کی مثل سمجھنا گمراہی و نادانی ہے۔

سوال ۱۷

"كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ۝ (اللہ تعالیٰ ہر روز کسی نہ کسی کام میں ہیں) اللہ تعالےٰ ایک کام ختم کرتے ہیں پھر دوسرا کام پکڑتے ہیں۔ یہ مشابہت مخلوق اور حالت کی تبدیلی ہے۔ لہذا مسلمانوں کا خدا قدیم اور باقی نہیں ہو سکتا"۔

جواب:

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "وہ ہر دم و ہر لحظہ کسی نہ کسی کام میں ہے"۔ اس آیت میں خدا کا ذکر کہاں ہے۔ یہ تو نفسِ انسان کی کیفیت ہے کہ وہ سکنڈ کے ہزارویں حصہ کو بھی بے کار نہیں رہتا۔ اگر کہنے، سننے، کرنے کو کچھ نہ ہو تو اپنے اندر کے تصاویر و نقوش و مدرکات و محسوسات کے خزانوں کو جو اس کے اندر جمع ہیں، ہر دم و ہر لحظہ الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔

سوال ۱۸

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت و دوزخ ہمیشہ رہنے والے ہیں، اور قرآن کہتا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (جو بھی اس پر ہیں سب فنا ہونے والے ہیں اور اللہ کی ذات ہی باقی رہے گی جو جلال و اکرام والا ہے) پھر جنت و دوزخ کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟ (چونکہ اس میں زمین والے ہی ہونگے) اور اگر باقی رہیں گے تو کیا جنت و دوزخ بھی اس کی ذات کا جزء یا شریک ہیں؟"

جواب:

پہلا جواب تو یہ ہے کہ جو زمین پر ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں اور جنت و دوزخ زمین پر نہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وجہ کے معنی ہیں اگلا حصہ، چہرہ یا نفس۔ پس چہرے سے شناخت ہوتی ہے۔ لہٰذا خدا کی معرفت کے ذرائع وجہ اللہ ہیں۔ یہ ذرائعِ معرفت باقی رہیں گے اور وہ ایسے نفوس قدسیہ ہیں جو عارفانِ کامل اور اس کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔

سوال ۱۹

" فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ آدم وحوا کے قصہ میں ہے کہ ان کو جنت میں رکھا گیا اور اللہ پاک نے ایک درخت کا پھل کھانے سے ان کو منع کر دیا تو شیطان جو جنت سے نکال دیا گیا تھا اور اس کو جنت میں جانے کا حکم نہ تھا۔ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا اور آدم و حوا کو بہکا دیا۔ اس طرح انہوں نے پھل کھا لیا۔

مسلمانوں کا خدا بھی کیسا منتظم ہے کہ شیطان کو جنت میں جانے سے نہ روک سکا۔ شیطان نے خدا کو بھی دھوکا دے دیا اور اس کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ ایسے غافل خدا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

جواب:

یہ تمام آیات متشابہات ہیں۔ ان کو محکم سمجھ لینا گمراہی ہے۔ اس کی حقیقی تاویل واضح کرنے کے لیے پورے ایک رسالہ کی ضرورت ہے۔ اس کی مفصل توضیح کتاب انوار الایقان کے ابواب چہارم اور پنجم میں بیان کی گئی ہے۔ شائقین اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۰

" مسلمانوں کے بعض فرقوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کی صفات قدیم ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بہت سے قدیم ہو گئے لہذا توحید نہ رہی اور بعض صفات کو عین ذات کہتے ہیں مثلاً خدا قادر ہے عالم ہے حیّ ہے۔ اس سے یہ

مراد ہے کہ خدا کی ذات ہی علم ہے۔ وہ خود ہی قدرت ہے۔ وہ خود ہی حیات ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس اگر یہ درست ہے تو کچھ نہ کچھ علم و قدرت و حیات بندہ میں بھی ہوتے ہیں تو کیا اس میں خدا کی ذات ہوتی ہے یا اس کا کوئی جزء ؟ خدا مدرک ہے اور ادراک کہتے ہیں بلا واسطہ علم حاصل کرنے کو۔ لہذا مدرک تو ہوگا جسے پہلے علم نہ ہو، تو کیا خدا بھی ایسا ہی ہے ؟

جواب :

جو لوگ خدا کی صفات لفظوں میں بیان کر کے اس کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں وہ شرک باطنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ خدا کی صفات جو لفظوں میں بیان کی جاتی ہیں، ان کا مقصد محض اس کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ تو فرماتا ہے :۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (پ ۲۵) — اس کی شبہ مثل بھی کچھ نہیں۔

دوسری جگہ فرماتا ہے :۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ — اللہ تعالیٰ منزہ اور پاک ہے ان تمام صفات سے جو لوگ بیان کرتے ہیں۔

(سورہ مومنون) (پ ۱۸ - ع ۵)

مطلب واضح ہے کہ اس کی صفات لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتیں۔ اس کی ذات اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے ؎

واعظ یہ کہہ دو جو تری فہم میں آئے — یہ سب ہے ترا وہم خدا اور ہی کچھ ہے

الحمد للہ رب العلمین

تمام شد رسالہ انوار الاسلام

(مطبوعہ :۔ نقوش پریس - لاہور)